ماہنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد : ۵ ——— شمارہ ۸، ۹

اگست، ستمبر ۱۹۹۰ء

بدل اشتراک

سالانہ زرِ تعاون :	۳۰ روپئے
خصوصی تعاون :	۱۰۰ روپئے
غیر ممالک :	۲۰ امریکی ڈالر
اس شمارہ کی قیمت :	۲/۴ روپئے

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

مدیر

محمد اسمٰعیل فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو جامعۃ الفلاح بلریاگنج، اعظم گڑھ یوپی ٢٧٦٤٠٤

افضل نعیمی پریس برائے جمال پرنٹنگ پریس دہلی

نقوش حیات نو

* اداریہ

عالم اسلام کے لئے ایک اور آزمائش — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۳

* بحث ونظر

تحریک آزادی ہند — عبدالبر اثری فلاحی — ۷

اسالیب قرآن — خالد مسعود — ۱۴

آرکائیوز — ایک اجمالی تعارف — محمد اسحاق فلاحی — ۲۶

سندھ کی عظمت اور اس کے بعض کمزور پہلو — مولانا امین احسن اصلاحی — ۳۵

جاہلی شاعری کا مطالعہ — عین الحق قاسمی — ۴۴

خدمت خلق — شریف احمد بارہ بنکوی — ۶۱

● تعارف وتبصرہ — عبدالبر اثری فلاحی — ۶۴

* اخبار علمیہ — شہنواز قمر بنارسی — ۶۸

● نعت — ۳۴

* جامعہ کے لیل ونہار — محمد اسمٰعیل فلاحی

امیر جماعت اسلامی کی آمد — ۷۰

مولانا محمد ذات اللہ صاحب اصلاحی کی آمد

اداریہ

محمد اسمٰعیل فلاحی

عالم اسلام کیلئے ایک اور آزمائش

کلیلہ ودمنہ میں ایک سبق ہے باب الحمامة المطوقة، اس میں چار وفادار و جاں نثار دوستوں کا تذکرہ ہے، کوا، ہرن، کچھوا اور چوہا، گردش روزگار کے ہاتھوں یہ مسلسل حوادث کا شکار ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ چوہا گھبرا کر پکار اٹھا۔ ما ازال اتجاوز عقبة من البلاء الا صرت في اشد منها۔ عجیب صورتحال ہے، ہم مصیبت کی ایک گھاٹی سے ہم نکل نہیں پاتے کہ اس سے مہلک اور اس سے شدید تر میں جا پڑتے ہیں۔

کچھ یہی صورتحال ہماری ہوگئی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ سنگین، نازک اور پیچیدہ۔ کسی قوم پر برے دن آتے ہیں تو کبھی ادھر سے طمانچہ لگتا ہے، کبھی ادھر سے، کبھی یہاں بجلی ہے کبھی وہاں گرتی ہے۔

مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک پوری ملت مسلمہ جن المناک اور کربناک حالات سے گذر رہی ہے، زبان وقلم ان کے بیان سے عاجز ہیں۔ پورا جسم تار تار ہے جسم کا کون سا حصہ ہے جو زخموں سے چور اور نڈھال نہ ہو، سر پہ چوٹ، آنکھ ناک زخمی، ٹانگ ٹوٹی ہوئی، بازو شل، سینہ چھلنی، کان کٹے ہوئے، دل وجگر پارہ پارہ، وہ کون سا عضو ہے جو صحیح سالم ہوگا۔

دل کو دردوں میں اجڑ کو میسر — میری دلوں سے آشنائی ہے

حالات کی سنگینی کا یہ عالم ہے کہ ایک مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ دس مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک مصیبت سے چھٹکارا نہیں ملتا کہ الٹی تدبیریں مزید مشکلات پیدا کر دیتی ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ حدیث نبوی کے مصداق پوری دنیا متحد ہو کر ہم پر ٹوٹ پڑی ہے اور ہمیں نگل جانا اور ہڑپ کر جانا چاہتی ہے۔ قبلہ اول ابھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ افغانستان کے جیالے مردوں کے نذرانے ابھی پیش کر رہے تھے، کشمیر سے آہوں اور کراہوں کا دھواں ابھی اٹھ رہا تھا اور پورا سندھ بھائی کے ہاتھوں بھائی کے خون سے لالہ زار تھا کہ ایک نئی آفت آ پڑی۔ صدام حسین نے کویت پر حملہ کر کے اسے عراق کا ایک حصہ قرار دے لیا اور اس طرح اپنے دیرینہ منصوبہ کو خلیج میں پورا کرنے کے لئے امریکہ کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔

خلافت اسلامی سے بہت دور ہونے کے باوجود کویت و سعودیہ سے دنیا بھر کی اسلامی تحریکات کو جس طرح غذا مل رہی تھی اور یہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے جو آگے چل رہے تھے، صہیونیت اسے کب برداشت کر سکتی تھی؟ افسوس اس کا ہے کہ صدام حسین اس کا مہرہ بنے۔ ماضی میں انھوں نے اخوان المسلمون کے ساتھ جو کچھ کیا اس کے گہرے نشانات ابھی تازہ ہیں۔ اگر وہ وسیع البنیان اسلامی حکومت کا خواب دکھلا رہے تھے تو پہلے اپنے قلمرو میں وہ اس سے پہلے خود اپنے اوپر انھیں اسلام قائم کرنا تھا۔ پھر عالم اسلام ان کے حوصلوں کو پورا کرنے میں ان کا ساتھ دیتا۔ اس کے برعکس ہم عراق میں بدترین قسم کی آمریت دیکھتے ہیں۔

یقیناً عراق جارح ہے۔ اس نے نہ صرف دینی و اخلاقی قدروں کو بلکہ عالمی اور انسانی قدروں کو پامال کیا ہے لیکن اس سب کے باوجود عراق صدام حسین کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک آمر کی آمریت کے کانٹے ہیں جن سے ہمارے تلوے خونچکاں ہیں۔ عراق ایک مسلم ملک ہے اس کی طاقت امت مسلمہ کی طاقت ہے۔ اس ناعاقبت اندیش کی نادانی کے جواب میں ایسا رویہ اختیار کرنا جس سے عراق برباد ہو جائے اور اس کی طاقت ٹوٹ پھوٹ جائے کسی طرح مناسب نہیں۔ ادھر بھی خون مسلم ہے ادھر بھی۔ عالم اسلام کو ایسا موقف اختیار کرنا چاہیئے کہ کویت سے عراقی فوجیں فوراً نکلیں اور امریکہ سعودیہ سے واپس جائے

اور یہ اپنے مسائل میز پر بیٹھ کر حل کریں۔

صدام حسین اور اس جیسے طالع آزما سیاستدانوں کو یہ بات بھولنی نہیں چاہیئے کہ اس دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر جابر آئے، بڑے دبدبے اور طنطنے کے ساتھ آئے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ان کا رخ موڑ نہیں سکتا اور انھیں کوئی ہلا نہیں سکتا لیکن جب وہ اکھڑے ہیں تو ایسے جیسے ان کی کوئی جڑ اور بنیاد ہی نہ ہو۔ گھاس کی طرح زمین سے اکھاڑ لیا گیا ہو۔

ان حالات نے تصویر کا ایک اور رخ بہت واضح انداز میں ابھارا ہے۔ وہ یہ کہ خلیجی ممالک کے حکمراں اپنے عیش و عشرت پر خوب خوب دولت لٹاتے رہے لیکن شمشیر و سنان ہاتھ میں لینے کا سلیقہ انھیں نہیں آیا۔ اگر وہ اس حادثے سے سبق لیں تو یہ اس کے اندر خیر کا بہت بڑا پہلو ہوگا، جو قوم اپنے پیروں پر کھڑی نہیں رہ سکتی اور اپنے بازوؤں کے بل پر اپنی حفاظت نہیں کر سکتی، وہ دوسروں کے سہارے کب تک جیے گی

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

کویت، سعودیہ، عراق اور پوری اسلامی برادری کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیئے کہ نہ امریکہ ان کی حفاظت کر سکتا ہے، نہ روس، نہ کیمیاوی اسلحے کام دے سکتے ہیں نہ ایٹمی ہتھیار۔ ان کے مسائل کا حل خدا کی طرف پلٹ آنے میں ہے۔ رجوع الی اللہ ہی ان کے دکھوں کا مداوا ہے۔ دنیا کے تیور جو بگڑے ہیں اور حالات کا رخ جو بدلا ہے، یہ اس وجہ سے کہ ہم نے خدا سے بغاوت کی ہے، اس سے منہ موڑا ہے، آخرت پر دنیا کو ترجیح دی ہے۔ دنیا سے محبت کرنے اور موت سے گھبرانے لگے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

یوشک الامم ان تداعی علیکم کما تداعی الاکلۃ الی قصعتھا قالوا او من قلۃ نحن یومئذ؟ قال لا بل انتم یومئذ کثیر ولکنکم غثاء کغثاء السیل ولینزعن اللہ من قلوب عدوکم

المهابة منكم وليقذفن في قلوبكم الوهن قالوا وما الوهن يا رسول الله قال حب الدنيا وكراهية الموت۔

قریب ہے کہ قومیں تم پر ٹوٹ پڑیں جیسے بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کیا اس وقت ہماری تعداد کم ہوگی؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تم اس وقت بہت بڑی تعداد میں ہوگے لیکن سیلاب کے جھاگ کی طرح بے وقعت ہوگے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا دبدبہ ختم کر دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن ڈال دے گا۔ صحابہ نے پوچھا: وہن کیا ہے رسول خدا! آپ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت کا ڈر۔

خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت چھوڑ کر کوئی طریقہ کامیاب اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی بلکہ یہ برے دن آئے ہی اس لئے ہیں کہ ہم نے ان کی ہدایت سے بے نیازی برتی۔ ہمارے حالات سدھر سکتے ہیں تو بس اسی صورت میں کہ ہم انھی کی طرف پلٹیں اور اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے حوالہ کر دیں۔

لن يصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها

اس امت کے آخری اصلاح اسی چیز سے ہوگی جس سے اس کے اول کی ہوئی ہے۔

علالت اور دیگر وجوہات کی وجہ سے ہمارے کاتب جناب رفیق احمد صاحب کے کتابت چھوڑ دینے کے بعد حیات کو اب تک کوئی مستقل کاتب نہیں مل سکا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں بڑی پریشانیوں کا سامنا ہے۔ افسوس ہے کہ وقت پر کتابت نہ ہو سکنے کی وجہ سے دو ماہ کا مشترکہ شمارہ نکالنا پڑا ہے اور اندیشہ ہے کہ اگلا شمارہ بھی شاید دو ماہ کا مشترک نکلے۔

عبدالباری فلاحی

تحریک آزادی ہند

ایک مختصر معروضی جائزہ

انسان فطری طور پر کسی نہ کسی کی پیروی پر مجبور ہے خواہ وہ اللہ کی پیروی کرے یا غیر اللہ کی کرے۔ اللہ کی پیروی کا نام اسلام ہے اور غیر اللہ کی پیروی کا نام غلامی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اسی لئے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ جمع بھی نہیں ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام کبھی غلام نہیں رہ سکتے اور اگر کبھی خدانخواستہ کسی وجہ سے غلام ہو بھی جائیں تو اس پر کبھی قانع نہیں ہو سکتے بلکہ اس سے نجات پانے کے لئے خون کا آخری قطرہ تک لگا دیتے ہیں تاآنکہ آزادی حاصل ہو جائے یا جان جان آفریں کے حوالے کر دیں کیونکہ آزادی کے بغیر دین کے تقاضوں کی تکمیل ان کے لئے ناممکن ہوتی ہے چنانچہ عہد مغلیہ کے آخری ادوار میں جب مسلم حکمرانوں کے اندر مختلف کمزوریاں پیدا ہو گئیں اور سمندر پار کی اجنبی قوم انگریز نے دھیرے دھیرے ہندوستانی عوام کو اپنے زیر نگیں کرنا شروع کر دیا تو امت کے باضمیر اور باشعور طبقے نے اسے فوراً بھانپ لیا اور فوراً اس دام میں پھنسنے سے خود بچنے اور دوسروں کو بچانے کی فکر کرنے لگے۔

چنانچہ سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ نے والیان مملکت کو اس خطرہ سے آگاہ کیا، اور اس کی خاطر علمی تیاری اور عوامی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، بعد میں انکی بنیاد پر ان کے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیزؒ نے اس مشن کو آگے بڑھایا، چنانچہ ۱۸۰۳ء میں ان کا وہ مشہور فتوی شائع ہوا جس میں انھوں نے شہری آزادی کے سلب ہو جانے، مذہب کا احترام ختم ہو جانے اور قانون سازی کے حق انگریزوں

عیسائیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوجانے وغیرہ اسباب کی بنیاد پر ہندوستان کو "دارالحرب" قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان جنگ کرے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کرے اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لئے حرام جانے۔ چنانچہ اس فتوے نے ہندوستانی عوام کے اندر آزادی کی آگ بھڑکا دی۔ بعد میں اس سازگار فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ عبدالعزیزؒ نے سید احمد شہیدؒ کے زیر قیادت ایک گروپ تیار کیا۔ مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا اسماعیلؒ کو ان کا مشیر خاص متعین فرمایا اور ان کے ذمے یہ کام کیا کہ وہ ملک میں دورہ کرکے روح انقلاب پیدا کریں، رضاکار بھرتی کریں اور ان کو فوجی ٹریننگ دیں، اسلحہ فراہم کریں، دیگر ممالک سے تعلقات پیدا کریں اور پھر باضابطہ اگلا قدم اٹھائیں۔ چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لئے ۷۰۰ افراد پر مشتمل قافلہ ۱۸۲۶ء میں دہلی سے روانہ ہوا، پورے ملک کا دورہ کیا اور اس میں انھیں توقع سے زیادہ کامیابی ملی۔

چنانچہ مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں ۱۸۳۰ء میں انھوں نے پشاور کے علاقے میں عارضی آزاد حکومت کی داغ بیل ڈالی جو ہندوستان میں سب سے پہلی اسلامی حکومت تھی لیکن آغاز ہی میں درانی سردار یار محمد خاں نے سکھوں سے ساز باز کرکے اس گروہ مجاہدین کو دھوکہ دے دیا۔ چنانچہ جیتی ہوئی بازی ہار میں تبدیل ہوگئی۔

کیونکہ درانی سردار یار محمد خاں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے پشاور کا باج گذار حاکم تھا، بظاہر اپنی آزادی کا اعلان کرکے سید احمدؒ کے ساتھ شریک ہوگیا لیکن اس کی نیت میں کھوٹ تھا۔ چنانچہ عین جنگ کے موقع پر سید احمدؒ کو زہر دلوا دیا لیکن ہاتھی ان کی سواری کے لئے فراہم کیا اور جب لشکر مجاہدین غالب آنے لگا تو میدان جنگ سے اس نے اپنے ہزاروں کے لشکر کو لے کر فرار ہوگیا۔ جس سے افراتفری مچ گئی۔ جنگ کا نقشہ بدل گیا اور ساری جدوجہد خاک میں مل گئی۔

ایک طرف تو یہ کوششیں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف خود فرمانروان ملک اپنے اقتدار کے بچاؤ کے لئے ان قوتوں سے نبرد آزما تھے لیکن اپنی نااہلی اور کمزوری، دشمنوں

کی مکاری اور ریشہ دوانیوں کے آگے ان کی بھی ایک نہ چلی اور رفتہ رفتہ بھی ان کے شکنجے میں جکڑتے رہے۔ اولاً انگریزوں نے تجارتی مفادات کی حفاظت کے نام پر قلعے بنائے اور فوجیں جمع کیں دوسرے یہ کہ ہندوستان کی متحارب اقوام کے تنازعات کو مختلف طریقوں سے بڑھاوا دیا۔ تیسرے یہ کہ دربار شاہی میں اپنے ہمنوا بنائے اور پھر ان سے اپنے مفادات حاصل کئے۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے سب سے دولت مند علاقہ بنگال کو نشانہ بنایا۔

اور ۲۳ جون ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کو شہید کرکے اس علاقے کو غلامی میں جکڑا۔ واضح رہے کہ نواب سراج الدولہ کی شہادت اس کے وزیر میر جعفر اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے عمل میں آئی تھی۔ پھر انھوں نے ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر کے موقع پر شاہ عالم شہنشاہ ہند، شجاع الدولہ نواب اودھ اور میر قاسم نواب بنگال کی متحدہ فوجوں کو شکست دے کر اپنا سکہ جمایا۔

اور ۱۷۷۳ء میں انگریز جنرل ہیسٹنگز نے بڑی رقم لے کر نواب شجاع الدولہ والی اودھ کی مدد سے ہندوستان کی سب سے زیادہ جنگجو اور خطرناک قوت روہیلوں پر حملہ کرکے ان کا صفایا کردیا جو کسی طرح بھی روا نہیں تھا۔ اب انھیں صرف شیر میسور ٹیپو سلطان سے خطرہ تھا۔

چنانچہ سب سے پہلے تو اس کو مراٹھوں اور نظام کی مدد سے محروم کروایا اور پھر ۱۷۹۹ء میں میر صادق جیسے غدار کی مدد سے اس کا خاتمہ کرکے نعرہ لگایا "آج ہندوستان ہمارا ہے" اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ٹیپو سلطان کے بعد اب انھیں کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یکے بعد دیگرے سرنگوں ہوتے گئے۔

غرضیکہ سندھ، پنجاب اور دہلی سب ان کے قبضے میں آگیا اور آخر میں ۱۸۴۹ء میں بدانتظامی کا الزام لگا کر اودھ کی حکومت کا بھی خاتمہ کردیا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس سے معاہدہ ہوچکا تھا۔

ایک طرف تحریک مجاہدین کی ناکامی اور دوسری طرف مسلم حکمرانوں کی شکست خوردگی کے نتیجے میں ہندوستانی عوام بالکل مایوس ہوچکی تھی اور ان کے قویٰ جواب دینے لگے تھے۔

اب وہ اپنے اندر کچھ کرنے کی ہمت نہ پاتے تھے۔ لیکن انگریز جو مظالم ان پر ڈھا رہے تھے انھیں وہ کافی دنوں تک برداشت بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کا یقینی نتیجہ ان کی تباہی و بربادی تھی۔ چنانچہ ان کے اندر بغاوت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ اور مختلف سطح پر کوششیں ہونے لگیں۔ مولوی، پنڈت سبھی بغاوت کا بیج بونے میں مصروف تھے۔ نانا صاحب، مولوی احمد شاہ اور عظیم اللہ خاں وغیرہ نے خاموشی سے ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر کرکے بطور خاص انقلاب کی فضا ہموار کی اور تمام رہنماؤں کی متفقہ رائے سے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ بغاوت کے لئے متعین کی گئی لیکن ۲۹ مارچ کو ہی میرٹھ چھاؤنی میں منگل پانڈے نامی ایک ہندوستانی فوجی کو ایسے کارتوس کو کاٹنے پر اصرار کیا گیا جس کا منھ گائے یا سور کی چربی کا بنا ہوا تھا جب اس نے انکار کیا تو اسے کورٹ مارشل کیا گیا اور بے عزت و رسوا کیا گیا بس اس چھاؤنی کے ہندوستانی فوجیوں نے کھلی بغاوت کردی اور علاقہ میرٹھ پر قبضہ کرکے دہلی پر حملہ کیا اور اس پر بھی قبضہ کرلیا اس کاروائی کے ہوتے ہی پورے ملک میں بغاوت کی ایک لہر پھوٹ پڑی۔ اسی بغاوت کو "غدر" کا نام دیا جاتا ہے اس کی قیادت کے لئے بخت خاں جیسا جرنیل آگے بڑھا لیکن مغل شہزادوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ حکیم حسن اللہ خاں اور مرزا الٰہی بخش نے غداری کرکے انگریزوں کی جاسوسی کی اور ایک غدار نے تو انقلابیوں کا بارود خانہ ہی اڑا دیا نتیجۃً ہزیمت کھانی پڑی اور اس قدر قتل عام کیا اور لوٹ کھسوٹ مچائی کہ خود انھیں میں سے ایڈورڈ تھامسن نے کہا

"غدر سے متعلق تمام دستاویزات زبان حال سے ہماری زیادتیوں کا اعلان کرتی ہیں۔"

لیکن ان سب کے باوجود بھی ملت کا باشعور طبقہ خاموش نہیں بیٹھا بلکہ انھوں نے دوسرے انداز سے یہ کام شروع کردیا۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ہی مولانا قاسم نانوتوی نے "دارالعلوم" دیوبند کی بنیاد رکھی جس کے قیام کا مقصد صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ ایسے افراد تیار کرنا تھا جو فکری آزادی کے ساتھ ساتھ ملک و ملت کے کھوئے ہوئے وقار کو واپس دلا سکیں۔

چنانچہ اس مدرسہ کے سب سے پہلے طالب علم شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے اس کو ہمہ گیر تحریک کی شکل دینے کے لئے ۱۹۰۹ء میں جلسہ دستار بندی کے نام پر فارغین دارالعلوم کا ایک اجلاس بلایا اور تبادلۂ خیال کے بعد "جمعیۃ الانصار" کی تشکیل کی اور اپنے ایک نومسلم شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو اس کا سکریٹری منتخب کیا جن کی قیادت میں اس تحریک نے برطانوی حکومت کا تختہ الٹ دینے کا منصوبہ بنایا۔ ملک میں عام بیداری پیدا کرنے، بیرونی طاقتوں سے امداد کے منصوبے بنانے اور خفیہ طور سے ایسی جماعت تیار کرتے رہے۔ جو انقلاب کی راہ میں اپنی جانوں تک کی قربانی دیدیں۔ چنانچہ اسی تحریک کا نام آخری مرحلہ میں پہنچ کر "ریشمی رومال تحریک" پڑ گیا لیکن برا ہو آستین کے سانپوں کا کہ ٹھیک اس وقت جبکہ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں یہ سب خبریں اور ان کے مقامات کے پتے اور ریشمی رومال کی پوری تفصیل امیر حبیب اللہ خاں نے حکومت برطانیہ کو بتادی نتیجۃً سارا کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اس کے بعد بچا کھچا جذبۂ آزادی بھی نیست و نابود ہوگیا ایسے یاس و قنوط کے عالم میں سرسید کی اس فکر نے لوگوں کو سہارا دیا کہ موجودہ حکومت سے روابط بڑھا کر اور انھیں خوش کرکے ہی ہم عافیت سے رہ سکتے ہیں لیکن لوگوں نے کلی طور پر اسے تسلیم نہیں کیا اور مختلف انداز سے کسی نہ کسی سطح پر جد و جہد جاری رکھی جس کی وجہ سے پھر انگریزوں کو پریشانی لاحق ہوئی۔

چنانچہ انھوں نے ہندوستانی عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان کے قومی کارکنوں اور رہبروں کی کانفرنس بلائی جو ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء میں انگریز افسر اے او ہیوم کے زیر صدارت گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج کے ایک بڑے ہال میں بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوئی اور اس کا نام "انڈین نیشنل کانگریس" رکھا گیا جس کا خاص مقصد حاکم و محکوم کے درمیان روابط اور میل میلاپ پیدا کرنا قرار پایا کچھ دنوں تک تو گاڑی ایسے ہی چلتی رہی لیکن جب نہرو کی قوت کے اندر بھی طرح طرح کی آوازیں اٹھنے لگیں۔

اور بالآخر ۱۹۲۹ء میں لاہور اجلاس کے اندر گاندھی جی نے "سوراج" کا نعرہ پیش کیا جو مکمل آزادی کا تصور نہیں تھا جبکہ اس کے لئے بھی اہنسا اور پرامن طریقہ کار اپنانے کی شرط رکھی لیکن

اس سے بھی بات نہ بنی تو ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے الٰہ آباد اجلاس کے اندر سب سے پہلے حسرت موہانی نے مکمل آزادی کا تصور بطور تجویز پیش کیا اسی تجویز پر مہاتما گاندھی نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"حسرت صاحب ہم کو ایسے پانی میں لے جانا چاہتے ہیں جس کی گہرائی کا ابھی ہمیں اندازہ نہیں"

اور پھر تجویز نامنظور ہو گئی لیکن صورت حال جب مزید بگڑی تو ۱۹۳۱ء میں لاہور اجلاس کے اندر مجبوراً پنڈت جواہر لال نہرو کے زیر صدارت کانگریس نے جائز اور پر امن ذرائع سے مکمل آزادی (پورن سوراج) کے حصول کو اپنا نصب العین قرار دیا اس کے بعد پھر آزادی کی لہر نے زور پکڑا پہلے تو انگریزوں کے رویئے سے تنگ آکر ترک موالات کا آغاز ہوا پھر اگست ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ جاؤ آندولن شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری قوم انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئی شروع میں تو انگریزوں نے افہام و تفہیم سے اور کچھ رعایتیں دے کر ہندوستانی عوام کو رام کرنا چاہا، اسی سلسلے میں کئی گول میز کانفرنسیں ہوئیں لیکن قائدین آزادی آزادی سے کم پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔

چنانچہ مولانا محمد علی جوہر کا بہت مشہور قول ہے جو انھوں نے انگلستان کے اندر ایک گول میز کانفرنس میں کہا تھا کہ :-

"میں ہندوستان اسی صورت میں واپس جاؤں گا کہ میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہو، میں ایک غلام ملک کو واپس جانے سے پردیس میں دفن ہونے کو بہتر سمجھوں گا"

مجبوراً انھیں ملک چھوڑنا اور آزاد کرنا پڑا کیونکہ اس وقت ان کے اندر اس کی تاب نہیں تھی کہ وہ جد و جہد کا مقابلہ کر سکیں کیونکہ دوسری نو آبادیات میں مسلسل برسر پیکار رہنے اور شکست سے دوچار ہو جانے کے بعد ان کے اندر قوت تھی اور نہ ہی ہمت پڑ رہی تھی، چنانچہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک اہل وطن کے حوالے کر دیا لیکن ایسے میں بھی یوں ہی

حوالے نہیں کر دیا بلکہ مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا، تاکہ ان کی قوت کمزور پڑ جائے اور آئندہ ابھرنے کا موقع باقی نہ رہے، چنانچہ وہ اس تاک میں آج بھی لگے ہوئے ہیں۔

یہ ہے تحریک آزادی ہند کا ایک مختصر معروضی جائزہ جس کے اندر میں نے بطور خاص مسلمانوں کے رویوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے کیونکہ ہمیشہ سب سے پہلے اپنے ذہن میں سمجھنا چاہیے، اس پوری تفصیل سے جہاں یہ واضح ہے کہ آزادی کی تحریک شروع کرنے، اسے نشو و نما دینے اور اس کی خاطر خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے میں مسلمان پیش پیش رہے ہیں وہیں یہ بھی واضح ہے کہ جب جب یہ جد و جہد ناکامی سے دوچار ہوئی ہے اس کا سبب بھی عام طور سے مسلمانوں کی منافقت اور غداری کا نتیجہ ہے۔ اس منافقت کے خاتمہ اور اس سے بچاؤ کی کیا سبیل ہے، یہ بہر حال ایک سوچنے کا پہلو ہے کیونکہ آج بھی جبکہ ہم ہندو جارحیت کے غلام بنتے جا رہے ہیں جہاں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس سے آزادی اور نجات کی خاطر موثر جد و جہد کی جائے وہیں سابقہ تجربات کی روشنی میں یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس سلسلے میں مضر عوامل کے خاتمہ کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری یہ جد و جہد کسی ایسی ہی سازش کا شکار ہو جائے، نعوذ باللہ من ذالک۔

بقیہ: اسالیب قرآن: التفات

کے چند احوال بیان کئے گئے ہیں، ان کی صورت حال کو تمثیلات سے واضح کیا گیا ہے، پھر یا ایہا الناس کے عام صیغہ سے ان سے خطاب ہے اور آخر میں آیت ۴۰ سے ان سے براہ راست خطاب بنی اسرائیل کے الفاظ سے ہے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کی طرف سے انکار یا ناگواری کا اندیشہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی روایات میں آتا ہے کہ آپ جب کسی فرد کو اس کی غلطی پر ٹوکنا چاہتے تو اس کو خطاب کرنے کے بجائے یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کام کرتے ہیں۔ اس طریقہ میں بھی مذکورہ مصلحت ہی ملحوظ ہوتی ہے۔

... ...

خالد مسعود

اسالیبِ قرآن
التفات

قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے لوگ یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اس میں مضمون کی اس طرح کی بندش پائیں گے جو نثری مضامین کا خاصا ہوتی ہے یعنی یہ کہ پہلے موضوع کا تعارف کرایا جائے گا، پھر اس کو زیرِ بحث لایا جائے گا، اس سے متعلق ضروری دلائل فراہم کیے جائیں اور آخر میں بحث کو سمیٹا جائے گا۔ لیکن جب وہ کسی سورہ کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو کلام میں اس طرح کی کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی بلکہ وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن میں کلام کا رخ ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب تھے کہ اگلی ہی آیت میں خطاب مومنین کے ساتھ ہو گیا۔ ابھی مشرکین یا اہل کتاب مخاطب تھے کہ چند ہی آیات کے بعد مسلمانوں کے کسی طبقے سے کلام شروع ہو گیا۔ یہ انداز نثری مضامین میں اختیار نہیں کیا جاتا۔ یہ اگر ملتا تو خطیبوں کے ہاں ملتا ہے۔ یہ عربی ادب اور قرآن مجید کا ایک اسلوب ہے جس کو التفات کا نام دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی حیثیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک آسمانی خطیب ہے جو دنیا بھر کے تمام انسانوں کو خطاب کر رہا ہے۔ خطیب کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جب اپنا مدعا بیان کرتا ہے تو اپنے سامعین کو پیشِ نظر رکھتا ہے، چونکہ سامعین میں مختلف مزاج و استعداد

اور درجے کے لوگ شامل ہوتے ہیں اس لیے وہ ہر ایک کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر بات کرتا ہے۔ وہ کبھی دائیں جانب مڑتا ہے کبھی بائیں جانب، کبھی قریب والوں سے ہم کلام ہوتا ہے کبھی دور والوں کو مخاطب کرتا ہے تاکہ تمام سامعین کے ساتھ اس کا رابطہ رہے۔ ہر گروہ سے خطاب کرتے ہوئے اس کا لہجہ بدلتا ہے اور اس کا پیغام ہر ایک کے لیے الگ ہوتا ہے۔ قرآن مجید ایک ایسا آسمانی خطیب ہے جس کے پیشِ نظر دنیا بھر کے انسانوں کی اصلاح ہے۔ اس کے لیے حق کو واضح کرتا ہے۔ اگر اس کے بارے میں انسانوں کے جس طبقے میں بھی کوئی غلط فہمی پائی جاتی ہے اس کو رفع کرتا ہے۔ وہ ان کے رویوں پر تنقید بھی کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید کے لیے خطیبانہ اسلوب ہی موزوں تھا اور التفات اسی اسلوب کا مظہر ہے۔

جن لوگوں سے التفات کے اسلوب کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے انہوں نے قرآن مجید کو بے ربطی کا الزام دیا۔ اس الزام کو مغربی مستشرقوں نے خوب اچھالا۔ انہوں نے قرآن کریم کی نام نہاد بے ربطی کو اس کے "مولفین" کی کم علمی اور بے سلیقگی کا نتیجہ سمجھا اور اپنے زعم میں اس کی اصلاح کی تدبیریں کیں۔ نولڈیکی، ہیوبرٹ گرم، داؤد، میسور اور اوڈویل نے اپنے فہم کے مطابق قرآن کی سورتوں کی ترتیب بدل کر یہ مقصد حاصل کرنا چاہا اور قرآن کے نسخے شائع کیے۔

اس کے بعد رچرڈ بیل نے سورتوں کی کاٹ چھانٹ شروع کی۔ اپنے زعم میں اس نے "غیر مربوط" آیات کو دوسری "موزوں" سورتوں میں جگہ دی اور اس طرح قرآن کا ایک ایسا نسخہ تیار کیا جو اس کی دانست میں زیادہ مربوط اور ریڈنگ کا اچھا نمونہ تھا لیکن پہلی کوششوں کی طرح تحریفِ قرآن کی یہ نئی کوشش خود مستشرقین کی نگاہوں میں بھی کوئی وقعت نہ پا سکی اور قرآن کی یہ "خدمت" لا حاصل رہی۔ ہمارے نزدیک محرفین کی مذکورہ کوششیں بڑی حد تک التفات کے اسلوب سے ناواقفیت کا شاخسانہ ہیں حالانکہ یہ اسلوب قرآن ہی کا نہیں عربی ادب کا اسلوب ہے اور اس کی مثالیں عرب شعرا کے کلام اور کعب بن زہیر، اعشیٰ اور دوسرے شعرا کے قصیدوں میں ملتی ہیں۔

اہل بلاغت کے ہاں التفات کا تصور

اہل بلاغت عموماً جس چیز کو التفات میں شمار کرتے ہیں وہ ضمیروں کا وہ انتشار ہے جس کے کلام متکلم سے مخاطب، مخاطب سے غائب اور غائب سے متکلم یا مخاطب کی طرف پھرتا رہتا ہے۔ اس کو چند مثالوں سے سمجھنا مناسب ہوگا۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا	بے شک ہم نے تم کو ایک
لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ	کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی کہ اللہ تمہارے
مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (فتح ۱-۲)	تمام اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخشے۔

یہاں آیت کا آغاز ضمیر متکلم سے ہوا لیکن آگے لنغفر لک کہنے کے بجائے ضمیر غائب استعمال کر دی گئی تاکہ مغفرت کو ذات باری تعالیٰ کی صفات سے وابستہ کر دیا جائے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ	ہم نے تم کو بخشا کوثر، تو اپنے خداوند
لِرَبِّكَ وَانْحَرْ	ہی کی نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی
(کوثر ۱-۲)	کرو۔

یہاں کلام کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ پہلی آیت کی ضمیر متکلم کے ساتھ ہم آہنگی کے لیے فصل لنا کہا جاتا لیکن ربوبیت کے اظہار کے الفاظ استعمال کر دیے گئے تاکہ رب کی ربوبیت کا حق واضح ہو جائے۔

وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا	اور اس نے ہر آسمان میں اس کے
وَزَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا	متعلق احکام وحی کر دیے اور ہم
(فصلت ۱۲)	نے آسمان زیریں کو چراغوں سے سنوارا۔

یہاں کلام کا آغاز ضمیر غائب سے ہوا لیکن آگے ضمیر متکلم استعمال کی کیونکہ افضال و عنایات اور اہتمام کے ذکر کے لیے یہی صیغہ موزوں تھا۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى	پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے

بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ	کو لے گئی ایک شب مسجد حرام سے اس
الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ	دور والی مسجد تک جس کے اردگرد کو ہم نے
الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ	برکت بخشی تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں

مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (بنی اسرائیل ۱) دکھائیں۔ بے شک سمیع و بصیر وہی ہے۔

یہاں آیت کے آغاز اور اختتام پر ضمیر غائب استعمال ہوئی ہے۔ جب کہ وسط میں ضمیر متکلم۔ اہل بلاغت کے نزدیک بات اگر ایک ہی انداز میں کہی جا رہی ہو تو سامع اس سے اکتا جاتا ہے۔ التفات کا اسلوب یہ بے زاری پیدا نہیں ہونے دیتا۔ نیز ضمیروں میں بدل کر لانے میں کچھ اور باتیں بھی ملحوظ ہوتی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا کوئی حق اور اس کی صفات کا کوئی تقاضا بیان کرنا ہو تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کرنا مناسب ہوتا ہے۔ اگر اس کی افضال و عنایات کا بیان ہو تو جمع متکلم کی ضمیر موزوں ہوتی ہے۔ غیظ و غضب کے اظہار کا موقع ہو تو کسی کو مخاطب کرنا بلیغ ہوتا ہے جب کہ نفرت کے اظہار کے لیے منہ پھیر کر بات کی جاتی ہے اور اس کے لیے غائب کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

التفات کا جامع تصور

التفات کا یہ تصور جسے اہل بلاغت نے پیش نظر رکھا ہے نہایت محدود ہے۔ اس کا جامع تصور یہ ہے کہ اس اسلوب میں کلام کا رخ ایک گروہ سے دوسرے گروہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے استعمال کی شان یہ ہے کہ یہ اسلوب آیات سے بڑھ کر آیات کے مجموعوں میں اور پھر سورتوں تک پھیل گیا ہے۔ کچھ کی وضاحت آگے کے مباحث سے ہو جائے گی۔

آیات میں التفات

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا	یوسف اس کو چھوڑو اور تو اسے

وَاسْتَغْفِرِي لِذَنْبِكِ ۔ (یوسف ۲۹) عورت اپنے گناہ کی معافی مانگ ۔

یہ عزیز مصر کا وہ کلام نقل ہوا ہے جس میں اس کے مخاطب حضرت یوسف علیہ السلام بھی تھے اور اس کی بیوی بھی۔ حضرت یوسف کو اس نے یہ ہدایت کی وہ اس صورت حال کو اہمیت نہ دیں۔ جس سے وہ دوچار ہوئے اور اپنی بیوی کو خطاکار سمجھتے ہوئے اس نے تنبیہ کی کہ وہ اپنی غلطی پر شرمسار ہو اور معافی مانگے۔

قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ۔ (الشعراء ۲۷-۲۹)

فرعون نے کہا تمہارا یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے بالکل پاگل ہے۔ موسیٰ نے کہا مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب اگر تم عقل رکھتے ہو۔ وہ بولا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کر کے رہوں گا۔

ان آیات کا موقع وہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں تقریر کرتے ہوئے رب کی صفات بیان کر رہے ہیں۔ فرعون اپنے درباریوں کی نگاہوں میں حضرت موسیٰ کو گرانے کے لئے یہ کہتا ہے کہ یہ شخص دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی باتیں لائق توجہ نہیں۔ حضرت موسیٰ اس تبصرہ کے باوجود اپنی تقریر جاری رکھتے ہیں تو فرعون زچ ہو کر انھیں مخاطب کر کے کہتا ہے کہ مجھے الٰہ نہ مانو گے تو میں تمہیں قید کردوں گا۔ خطاب کا رُخ بدلنے کا نام التفات ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۔ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ (فتح ۸-۹)

بے شک ہم نے تم کو گواہی دینے والا، خوشخبری پہنچانے والا اور آگاہ کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگو تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

پہلی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ و مقام واضح فرمایا ہے اور اس میں خطاب خود انہی سے ہے۔ دوسری آیت میں اس مرتبہ و مقام کے تقاضے سے مسلمانوں کو آپ کے حقوق یاد دلائے ہیں۔ اس میں خطاب اہل ایمان سے ہو گیا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (نحل ۴۳، ۴۴)

اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو دلائل اور کتابوں کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے۔ تو لوگو اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ اور ہم نے تم پر یاد دہانی اتاری تاکہ لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔

یہاں کلام کے پہلے اور آخری حصہ میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ نکتہ جتایا گیا ہے کہ تمام سابق انبیاء کی طرح آپ بھی بشر ہیں جن کی طرف وحی نازل کی جا رہی ہے۔ درمیان میں خطاب معترضین سے ہے کہ اگر تمہیں اس بات پر یقین نہیں آتا تو پہلے کے حاملین کتاب سے پوچھ دیکھو وہ بھی بتائیں گے کہ ماضی میں ہمیشہ بشر ہی آتے رہے ہیں۔ ان میں کوئی فرشتہ نہ تھا۔

آیات کے مجموعوں میں التفات

التفات کے ایسے مواقع جن میں کئی کئی آیات کے مجموعے مختلف گروہوں کو مخاطب کرتے ہوں سورتوں میں اس قدر کثرت سے ہیں کہ ذرا سے غور کے بعد ایک قاری ان پر متنبہ ہو جاتا ہے۔ سورہ بقرہ ہی کو لیجیے اس میں یایھا الناس، یٰبنی اسرائیل اور یایھا الذین آمنوا سے

آغاز کر کے مختلف گروہوں کو مخاطب کیا ہے اور ان کو الگ الگ تعلیم دی۔ بیچ بیچ میں جہاں ضرورت کا تقاضا ہوا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ سب التفات ہی کی مثالیں ہیں۔ تاہم اسلوب کو سمجھنے کے لیے چند ایسی آیات کی نشاندہی ضروری ہے جہاں مخاطب کی تبدیلی یک لخت واقع ہوئی ہے۔

۱۔ التفات کی نہایت قریب الفہم مثال سورہ فاتحہ میں ہے۔ اس میں ہم اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا اقرار کرتے ہیں لیکن اس کو مخاطب کر کے ان صفات کا حوالہ نہیں دیتے۔ اس کے بعد ایاک نعبد وایاک نستعین سے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے اس سے دعا کرتے ہیں۔ اس میں بلاغت یہ ہے کہ مدح کے مواقع پر غائب کا صیغہ موزوں سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس میں مخاطب کی تعظیم اور اس کے مرتبہ جلیلہ کا لحاظ زیادہ ہے لیکن دعا اپنائیت اور اللہ کے سامنے اظہار عجز کا تقاضا کرتی ہے جس کے لیے حاضر کا صیغہ زیادہ موثر ہوتا ہے۔

۲۔ سورۂ مزمل کی ابتدائی چودہ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری ہدایات دی گئی ہیں جنہوں نے آپ کو فکرمند کر رکھا ہے۔ آپ کو قیام لیل، تلاوت قرآن، ذکر الٰہی اور توکل و استقامت کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے بعد آیات ۱۵ تا ۱۹ میں قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے ان کو تنبیہ کی ہے کہ ہمارے رسول کی تکذیب کرتے وقت اس انجام کو یاد رکھو جس سے حضرت موسیٰ کی نافرمانی کے باعث فرعون اور اس کی قوم کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ آگے آیت ۲۰ میں پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان مخاطب ہیں۔

۳۔ سورہ ہود میں قوم نوح کی ہلاکت اور حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کی نجات کا واقعہ مفصل بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ	یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے

نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَٰذَا فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ۔ (ہود ۴۹)	جو ہم تم کو وحی کے ذریعے سنا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ ہی۔ تو ثابت قدم رہو، انجام بخیر کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔

اسی طرح کے موقع کی دوسری مثالیں سورۂ آل عمران میں آیت ۴۴ اور سورۂ قصص آیات ۴۴ تا ۴۶ میں ہیں۔

۴۔ سورۂ آل عمران کی آیات ۱۵۶ تا ۱۵۸ میں مسلمانوں کو نصیحت ہے کہ وہ کفار و منافقین کی روش کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ ادائے فرض کی راہ میں مرنا دنیا کی زندگی کے تمام اندوختوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (آل عمران ۱۵۹)	یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ تم ان کے لیے نرم خو ہو۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو تمہارے پاس سے یہ سب تتر بتر ہو جاتے۔ سو ان سے درگزر کرو، ان کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ پس جب تم فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بیشک اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بطور التفات وارد ہوئی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کریمانہ طرز عمل کی تصویب ہے جو آپ نے منافقین کے ساتھ روا

رکھا تھا اور آئندہ بھی اسی روش پر قائم رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

سورتوں میں التفات

قرآن مجید کی ترتیب میں غور کیا جائے تو ان میں بعض سورتیں ایسی نظر آتی ہیں جو التفات کے قاعدے سے آئی ہیں۔ مثال کے طور سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح دونوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی افضال و عنایات کا حوالہ دیا گیا ہے اور خاص طور آپ کو مخاطب کر کے تسلی دی ہے کہ مشکلات سے گھبرائیے نہیں، فیروز مندی آپ کے لئے مقدر ہے۔

سورہ کوثر، کافرون اور نصر بھی التفات کی سورتیں ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ خبر دی ہے کہ آپ کے لئے نصرت غیبی ظاہر ہوگی کہ فتح ہوگا اور جس مشن پر آپ مامور ہیں اس سے سرخرو ہو کر کامیابی سے ہم کنار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ التفات ہے۔

سورہ مزمل اور سورہ الاعلیٰ بھی فی الجملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے التفات کی سورتیں ہیں اگرچہ ان میں قریش کو بھی ضمناً مخاطب کیا گیا ہے۔

التفات کے موقع پر چونکہ کلام کا رخ یک لخت بدل جاتا ہے اس لئے لوگ عام طور پر یہاں کوئی جملہ حذف مان لیتے ہیں۔ مثلاً اگر خطاب اہل کتاب سے براہ راست ہو گیا ہے تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ خطاب بلاواسطہ کیسے ہو گیا۔ چنانچہ وہ لفظ قل محذوف مانتے ہیں تاکہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہو جائے حالانکہ قرآن میں متعدد ایسی آیات موجود ہیں جن میں اہل کتاب سے خطاب قل سے شروع ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اگر کلام بواسطہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مقصود ہوتا تو جملے سے پہلے لفظ قل لگایا جا سکتا تھا۔ اگر نہیں لگایا گیا تو اس کو حذف مان کر اپنی طرف سے لگانا بلاغت کے خلاف ہوگا۔ مثلاً آیت۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ	اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا
رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا	رسول وہ بہت سی باتیں ظاہر کرتا ہوا

مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ	آگیا ہے جو تم کتاب کی چھپاتے
الْكِتَابِ (مائدہ ۱۵)	رہتے ہو۔

میں بلاغت اسی صورت میں قائم رہتی ہے جب یہ مانا جائے کہ اس میں التفات کے طریقہ پر یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے تنبیہ کی گئی ہے۔ اس سے پہلے لفظ قل حذف نہیں ہے۔

احوال قیامت کے ضمن میں وہاں پیش آنے والی صورت حال کو کئی جگہ قرآن نے حاضر کے صیغے میں بیان کیا ہے تاکہ صورت حال متمثل ہو کر سامنے آ جائے۔ ان مواقع میں بھی لوگ کچھ حذف مان لیتے ہیں حالانکہ یہ التفات کا موقع ہوتا ہے جس میں کوئی جملہ محذوف ماننا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر یوں فرمایا۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ	اور ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کے
فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ	گلے کے ساتھ باندھ دیا ہے اور ہم قیامت
الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا	کے روز اس کے لئے ایک دستاویز نکالیں
اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ	گے جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا۔
الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا۔	او پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود
(بنی اسرائیل ۱۳-۱۴)	ہی اپنا حساب کرنے کے لئے
	کافی ہو۔

اس آیت میں اقرأ سے پہلے "انسان سے کہا جائے گا" کے الفاظ محذوف ماننا ضروری نہیں کیونکہ یہاں التفات کا اسلوب ملحوظ ہے اور انسان کو براہ راست مخاطب کر لیا گیا ہے۔ اس کی مزید مثالیں زخرف ۷۰، ذاریات ۱۴، محمد ۱۳، ۱۴، ۱۰، ۱۹ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اسلوب التفات کے فوائد

التفات کے اسلوب کا عام فائدہ سامع کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنا اور اس کو چوکنا کر

اپنی بات سناتا ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس سے اس کی کوئی غرض وابستہ ہوتی ہے۔ یہ رویہ اگر پختہ ہو کر ایک عادت بن جائے تو آدمی بسا اوقات اس چیز کو بھی نہیں دیکھتا جو گرچہ قریب ہو لیکن اس سے اس کی کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ التفات کا اسلوب انسان کے اس جمود کو توڑتا اور اس کو غور و فکر کے لئے تیار کرتا ہے۔

اس اسلوب کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ایک حقیقت اگر غائب کے صیغہ سے بیان ہوئی ہے تو اس کے ذکر کو زیادہ پر تاثیر بنانے کے لئے اس کو حاضر کے صیغہ میں بھی بیان کر دیا جاتا ہے تاکہ قاری اس کو اپنے سامنے دیکھنے لگے اور وہ اس کے قلب پر اثر کرے۔ اوپر ہم نے احوال قیامت کی آیت کا جو حوالہ دیا، اس میں بھی یہ فائدہ پیش نظر ہے۔ اس سے قبل کی ایک آیت یوں آئی ہے۔

وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (مریم ۷۱)	تم میں سے ہر ایک کو بہرحال اس میں داخل ہونا ہے، یہ تیرے رب کے اوپر ایک طے شدہ امر واجب ہے۔

اس میں التفات ہے لیکن اسلوب کو نہ سمجھنے کے باعث اہل تاویل نے اس کو تمام انسانوں پر منطبق کر کے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ ہر انسان کو خواہ وہ نیک ہو یا بد جہنم پر سے گزرنا ہوگا۔ حالانکہ اس سے پہلے منکرین قیامت کا انجام زیر بحث ہے اور انہی کو حاضر کے صیغے میں متشکل کر کے خطاب کیا ہے۔ متقین کے حشر کی خبر آگے آیت ۸۵ میں الگ سے دی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ عزت و احترام کے ساتھ رب کے حضور لے جائیں گے۔

التفات کا اسلوب شدت عتاب اور غصہ کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے لئے حاضر کا صیغہ زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا (مریم ۸۸، ۸۹)	اور کہتے ہیں کہ خدائے رحمن نے اولاد بنا رکھی ہے۔ یہ تم نے ایک سنگین بات کہی ہے۔

یہاں حاضر کا خطاب انہی لوگوں سے ہے جن کا ذکر پہلی آیت میں غائب کے صیغے سے ہوا ہے۔ شدت خطاب کے موقع پر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جس کے متعلق بات کہی جا رہی ہے وہ اس کو سن بھی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون نے غرق ہوتے وقت جب خداوند بنی اسرائیل پر ایمان لانے کا اقرار کیا تو اس موقع پر قرآن مجید میں یہ آیت آئی ہے:

آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (یونس ۹۱)	کیا اب! حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے۔

اس آیت میں غائب کے صیغے کے بجائے حاضر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی اصول پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے مقتولین ـــــ اصحاب قلیب کو مخاطب کیا تھا۔

جس طرح زجر اور غضب کے مضمون کے لئے حاضر کا صیغہ زیادہ بلیغ ہے اسی طرح جہاں کسی کی تحقیر مقصود ہو یا جس کے متعلق بات کہی جا رہی ہے اس سے نفرت کا اظہار کرنا ہو تو مخاطب کسی دوسرے کو کر کے بات کہی جاتی ہے۔ مثلاً فرمایا:

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ ۝ فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ۝ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ (عبس ۵-۷)	جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے۔

یہاں بظاہر عتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے لیکن اس کا اصل رخ آپ کی طرف نہیں بلکہ قریش کے سرداروں کی طرف ہے جن سے کسی خیر کی امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان سے نفرت کے اظہار کے لئے ان سے رخ پھیر کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے۔

اسی طرح بعض مواقع میں خطاب واحد سے کرنے کے بجائے جماعت سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کی نمایاں مثال سورۂ بقرہ کے چند رکوع ہیں جن میں غائب کے صیغے سے بنی اسرائیل

(بقیہ: صفحہ)

★ محمد اسحاق فلاحی*

آرکائیوز — ایک اجمالی تعارف

انسان نے اس زمین پر جب شعور کی آنکھیں کھولیں اور نتیجۃً قیمتی احساسات اور کارنامے ریکارڈوں اور دستاویزوں کی شکل میں ظاہر ہوئے تو انہیں محفوظ کرنے کی بھی کوششیں ہوئی۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی زمانہ میں انسانی سرگرمیوں کی رفتار چونکہ بہت دھیمی تھی اس لئے اس کی ریکارڈ سازی بھی محدود رہی۔ لیکن تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ انسانی سرگرمیوں میں جتنی تیزی آگئی اور ریکارڈ سازی میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ قدیم زمانہ میں جب انسان فن تحریر سے ناواقف تھا، واقعات و خیالات کی صرف ذہنی یادداشت پر بھروسہ تھا۔ شروع میں ویدوں کو کاغذی پتوں پر نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ زبانی طور پر اس کی اشاعت ہوتی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ رگ وید کے بھجن یادداشت کے ذریعہ محفوظ کئے گئے تھے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے نشانات، خاکوں اور تصویروں کے ذریعہ نیز مٹی، لکڑی، پتھروں، چٹانوں، غاروں، پتوں اور جانوروں کی کھالوں پر کوئی نقش بنا کر انسان اپنے قیمتی ریکارڈوں کو محفوظ کرتا تھا۔

پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں ایتھنز کے باشندے اپنے قیمتی دستاویزات کو ایتھنز میں "میٹرون" یعنی خداؤں کی ماں کے مندر میں رکھتے تھے جو ان کی نظر میں سب سے زیادہ محفوظ تھا۔ وہاں معاہدے، قوانین، عوامی اسمبلی کے مسودات، تجویزیں، اور دیگر

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

سرکاری دستاویزات رکھے جاتے تھے۔ ان دستاویزات میں سقراط کا دفاعی بیان، ادبی اور ورزشی مقابلے جو قدیم یونان میں ہر چوتھے سال ہوتے تھے ان کے متعلق تاریخی تحریریں شامل تھیں۔ یہ ساری تحریریں تیسری صدی عیسوی تک پیپرس (PAPYRUS) کے خریطہ میں باقی اور محفوظ رہیں۔

قدیم ہندوستان میں ریکارڈوں کی حفاظت اور بقا کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ چاکیہ اور دوسرے بہت ریکارڈ محفوظ رکھے گئے تھے۔ ہیون چوانگ نے اپنے ہندوستانی سفرنامہ میں ایک ریکارڈ آفس کا ذکر کیا ہے جسے 'نیلا' پکارتے تھے۔ "ارتھ شاستر" اور "سکرانیتی" سے اکاشن پاتال کے نام کا علم ہوتا ہے جس کا ترجمہ "جنرل ریکارڈ روم" بھی کیا گیا ہے۔ ریکارڈوں کو گروپ کے تحت مرتب اور منظم کیا جاتا تھا۔ دہلی سلطنت کے سلسلہ میں قابل ذکر معلومات فراہم نہ ہو پائیں۔ البتہ مغل دور میں شاہی ریکارڈ آفس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ اکبرنامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے کس طرح ریکارڈ آفس قائم کیا تھا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو شاہی فرمان کے ذریعہ اس جانب توجہ دلائی گئی۔ مغل حکومت غالباً اپنی بہتر ریکارڈ سازی کی وجہ سے "کاغذی راج" سے موسوم ہوئی۔ سر جادو ناتھ سرکار نے مغل نظم مملکت کے تحت لکھا ہے کہ مغل افسروں کو مراسلات، ناموں کی فہرست، افسروں کی ملازمت کی تاریخ، مجموعہ سرکاری فرامین اور مالی حساب کتاب کی دو دو یا تین تین نقلیں رکھنی ہوتی تھیں۔ شاہجہان اور اورنگ زیب نے شاہی دستور العمل صادر کئے جس میں بہت سے قواعد اور فرامین کے علاوہ یہ بھی ہدایت تھی کہ سرکاری کاغذات مرکز روانہ کئے جائیں۔ مرہٹوں نے بستوں کی شکل میں ریکارڈ کو باقاعدہ شعبہ قائم کیا اور وہ بستے اب تک نہایت عمدہ طریقہ سے محفوظ اور موجود ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق سے اس بات پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے کہ ہندوستان کے پاس اپنے قدیم تہذیب و تمدن پر مشتمل ریکارڈوں کا وسیع اور قیمتی ذخیرہ تھا۔

کیونکہ ریکارڈوں کی قدر و قیمت کا نہ صرف ہمیشہ سے بیان احساس رہا ہے بلکہ ان کے انتظام، حفاظت اور بقا کی تاریخ بھی نہایت روشن رہی ہے لیکن بیرونی حملوں اور آفات ارضی و سماوی مثلاً سیلاب، قحط، جبری ہجرت، آتش زدگی اور دوسرے قدرتی عوامل نے ان کے قابل ذکر حصوں کو نیست و نابود کر دیا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان میں آرکائیوز کی ابتدا اور ارتقاء کے مختلف تاریخی مدارج کا باقاعدہ تحقیقی مطالعہ کیا جائے۔ یہ مطالعہ ایک طرف اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہوگا تو دوسری طرف اس سے ریکارڈ سازی، ان کی حفاظت اور بقا کے متعلق بہت سے نئے پہلو روشن ہوں گے۔

موجودہ زمانہ میں آرکائیوز نے مستقل ایک فن اور علم کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے اس کی طرف غیر معمولی توجہ دی ہے۔ فرانس پہلا ملک ہے جہاں ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے فوراً بعد نیشنل اسمبلی نے آرکائیوز قائم کیا جس میں نیشنل اسمبلی کے قوانین رکھے جاتے تھے ۱۲ ستمبر ۱۷۹۰ء کے ایک قانون کے تحت اس کا نام Archives nationales رکھا گیا۔ ۱۴ اگست ۱۸۳۸ء میں انگلینڈ میں پبلک ریکارڈ آفس کے نام سے مرکزی آرکائیوز قائم ہوا۔ ہندوستان میں ۱۸۹۱ء امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ کے نام سے آرکائیوز کی بنا پڑی، جس کا نام ہندوستان کی آزادی کے بعد بدل کر نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کر دیا گیا جو آج ایشیا میں ریکارڈ اور اس کے ساز و سامان پر مشتمل سب سے بڑے ذخیرے کا مرکز ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۹ جون ۱۹۳۴ء کے قانون کے تحت نیشنل آرکائیوز قائم ہوا۔ موجودہ آرکائیوز کی فنی اور علمی نوعیت کا تجزیہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آرکائیوز اور ریکارڈ کی معنوی وسعت کا بھی جائزہ لیا جائے۔ ریکارڈ کو لفظ عام طور پر آرکائیوز کے تقریباً ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ ان دونوں الفاظ کی اس فن کے

ماہرین نے مختلف تعریفیں کی ہیں۔ اس لئے ان کی کوئی قطعی اور منطقی تعریف کرنی قدرے مشکل ہے۔

لفظ ریکارڈ لاطینی لفظ Recordari سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم یادداشت اور دل کے ہیں۔ غالباً دل اس لئے کہ وہ یادداشت کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ ریکارڈ انسان کی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ ہے۔ ریکارڈ کی کوئی بھی مادی شکل ہو سکتی ہے۔ کتابیں، مخطوطات، کاغذات، تصویریں، نقشہ جات اور دوسری دستاویزی اشیاء ریکارڈ کی مختلف صورتیں ہیں۔ کوئی ریکارڈ کسی ریکارڈ ساز کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ یہ ریکارڈ ساز فرد، خاندان، ادارہ، تجارتی یا دوسری کوئی تنظیم یا سرکاری ایجنسی ہو سکتی ہے۔ ریکارڈ سازی میں ریکارڈ ساز کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ شرائط پر مشتمل ریکارڈ کو اگر اس کے ریکارڈ ساز یا اس کے قانونی وارث یا جانشین نے محفوظ کیا ہو یا وہ حفاظت کے مستحق ہوں تو صحیح معنوں میں وہ ریکارڈ کے احاطے میں آئیں گے۔ اگر کسی تحریر کی اہمیت اور قدر و قیمت وقتی اور عارضی ہے اور ریکارڈ ساز کے نزدیک اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں ہے تو وہ تحریر ریکارڈ کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ ٹی۔ آر۔ شیلنبرگ نے ریکارڈ کی تعریف یوں کی ہے:

"تمام کتابیں، کاغذات، نقشے، تصویریں یا دوسرے دستاویزی مواد خواہ اس کی مادی شکل اور خصوصیات کچھ بھی ہوں اور وہ قانونی ذمہ داریوں کی تکمیل میں یا اس کے اصل کام کی سرگرمیوں سے متعلق کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے سے ظہور میں آئی ہوں یا وہاں سے حاصل ہوئی ہوں اور اپنے کاموں، پالیسیوں، فیصلوں، طریقوں اور دوسری سرگرمیوں کی شہادت یا معلوماتی مواد کی خاطر جو ان کے اندر موجود ہے اس ادارے یا اس کے قانونی جانشین نے حفاظت کی ہو یا وہ حفاظت کے لائق ہوں۔"

آرکائیوز کا استعمال اردو زبان میں تو بالکل ہی نیا ہے۔ اردو میں اب تک جو الفاظ اس کے مترادفات کے طور پر اختیار کیے گئے وہ سب اس لفظ کے مفہوم کی تعبیر کے لئے ناکافی اور غیر موزوں ہیں۔ انگریزی اور دیگر یوروپی زبانوں میں بھی اس کا استعمال زیادہ پرانا نہیں ہے۔ انگریزی لغت "آکسفورڈ" میں اس لفظ کی تشریح یوں کی گئی کہ :-

(الف) ایک ایسی جگہ جہاں سرکاری کاغذات یا دوسرے اہم تاریخی دستاویزات رکھے جاتے ہیں

(ب) تاریخی کاغذات یا دستاویزات جن کی حفاظت اور بقا کا نظم ہو۔"

یونانی بہت سے الفاظ مثلاً Arche، Archaios، Archaic، Archaeology، Archeion ایک دوسرے سے معنی میں بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آرکائیوز کا لفظ Archeion سے ماخوذ ہے۔ اس لفظ کی لسانیاتی تفصیل میں گئے بغیر انگریزی میں اس کا مفہوم تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کاغذات اور دستاویزات، وہ عمارت جس میں یہ کاغذات اور دستاویزات رکھی جائیں نیز وہ نظم و نسق جس کے تحت ان کاغذات اور دستاویزات کی دیکھ ریکھ اور کارگذاری ہوتی ہے۔ اس اصطلاح کے قدیم یونانی مفہوم میں تو ہر وہ چیز جو کسی آفس سے تعلق رکھتی ہے خواہ اس کے فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان ہوں سب ہی اس کے آرکائیوز ہیں۔

علم آرکائیوز پر ہولینڈ کے تین ماہرین ایس. مولر (۱۸۴۸-۱۹۲۲ء)، جے. اے. فیتھ (۱۸۵۸-۱۹۱۳ء) اور آر. فروئن (۱۸۵۷-۱۹۳۵ء) نے ڈچ زبان میں نیدرلینڈ ایسوسی ایشن آف آرکائیوسٹ کے زیر اہتمام Handleiding voor het ordenen en beschrijven van archieven نامی رسالہ شائع کیا جس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۴۰ء میں نیویارک سے Manual for the Arrangement and Description of Archives —

کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس رسالہ میں ڈچ لفظ Archief کی تعریف ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے کہ :-

"تمام تحریری دستاویزات، نقشہ جات اور مطبوعہ مواد کسی انتظامی ادارہ یا اس کے کسی عہدیدار سے سرکاری طور پر ملی ہوں یا تیار کی گئی ہوں جب تک کہ یہ دستاویزات اس ادارہ یا اس عہدیدار کی تحویل میں رہیں۔"

سر ہلاری جینکنسن نے A Manual of Archive Administration میں اس اصطلاح کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے کہ ان دستاویزات کی نوعیت ایسی ہو کہ :-

"وہ کسی انتظامی یا نجی انتظام و انصرام کے دوران (خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری) معرض وجود میں آئے ہوں یا استعمال میں آئے ہوں اور بالآخر وہ ان کی ذاتی تحویل میں ان کی ذاتی معلومات کے لئے رہے ہوں اور وہ کسی ایسے فرد یا افراد، ادارہ کے قانونی جانشینوں کے ذریعے محفوظ رہے ہوں جو اس کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار ہوں۔"

اٹلی کے ایک آرکائیوسٹ Eugenio Casanova کے نزدیک اس لفظ سے مراد "ایسے دستاویزات کا باضابطہ مجموعہ جو کسی ادارہ یا فرد کی سرگرمیوں کے درمیان وجود میں آئی ہوں اور اپنی سیاسی، قانونی یا ثقافتی کی تکمیل کے لئے کسی ادارہ یا فرد کے تحت محفوظ رکھے جائیں۔"

مذکورہ بالا مختلف تعریفوں کی روشنی میں کسی چیز کے آرکائیوز میں شامل ہونے کے لئے چند چیزیں ضروری ہیں۔

۱۔ اس چیز کا وجود کسی نہ کسی مقصد کی تکمیل کے لئے ہوا ہو، کسی سرکاری دفتر میں یہ مقصد کسی سرکاری کام کی تکمیل ہے۔

۲۔ اس چیز کی قدر و قیمت اور افادیت جن کی خاطر ان کی حفاظت کا بندوبست

ہوتا ہے۔

۳۔ وہ چیز جو کسی مقصد کے تحت باضابطہ وجود میں آئی ہو اور اس کی افادیت اور قدر و قیمت بھی مسلّم ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اصل مالک یا اس کے قانونی جانشین کی نگرانی اور تحویل میں ہو تاکہ کسی قسم کی بیرونی آمیزش کا امکان نہ رہے اور عدالت میں ان کی محکم و قانونی حیثیت ہو۔

۴۔ مذکورہ بالا تعامل کی روشنی میں جو چیز وجود میں آتی ہو اس کا وجود منفرد ہوتا ہے۔ وہ چیز جو کسی خاص مقصد کے تحت وجود میں آتی ہو اس کا اعادہ کسی شکل میں دوبارہ ممکن نہیں ہوتا۔ کوئی کام جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس سے متعلق کاغذات کا فطری انداز میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک فائل کا ہر ٹکڑا اپنے ماقبل کے ٹکڑے یا ٹکڑوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور ماقبل کی تشریح اور وضاحت مابعد سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں کسی چیز کا اخراج یا ہیر پھیر سے نہ صرف صحیح صورت حال پر روشنی نہیں پڑ سکتی بلکہ تصویر کا رخ بھی بدل سکتا ہے۔

۵۔ سب سے اہم خصوصیت جس کے بغیر کوئی ریکارڈ آرکائیوز نہیں ہو سکتا وہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا نوعیت کے ریکارڈ حوالہ اور تحقیقی مقصد کے تحت مستقل حفاظت اور بقا کے لائق سمجھے گئے ہوں۔ اور جو کسی آرکائیوز میں یا تو رکھے گئے ہوں یا رکھے جانے کے لئے منتخب کئے گئے ہوں۔

ریکارڈ اور آرکائیوز میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ریکارڈ ایک وسیع لفظ ہے جس میں آرکائیوز کا مفہوم بھی شامل ہے۔ سارا آرکائیوز ریکارڈ ہے لیکن سارے ریکارڈ آرکائیوز نہیں ہیں۔ ریکارڈ جب ظہور میں آتا ہے اور اس پر کام ہوتا رہتا ہے اور اس کے مطابق مختلف سرگرمیاں جاری رہتی ہیں اس وقت وہ ریکارڈ اپنے حالیہ مرحلہ stage of currency میں ہوتا ہے۔ جب ریکارڈ اپنے اس دور سے گزر جاتا ہے تو وہ اپنے

نیم حالیہ مرحلہ میں داخل ہوتا ہے اس مرحلہ میں ان ریکارڈوں کی ریکارڈ ساز کو ضرورت پیش آتی ہے لیکن بہت کم۔ اس دوسرے مرحلہ سے گزر کر ریکارڈ تیسرے مرحلے میں داخل ہوتا ہے جس میں حالیہ مرحلہ معدوم ہو چکا ہوتا ہے۔ اس مرحلہ میں ریکارڈوں کو non-current کہتے ہیں۔ آرکائیوز دراصل اسی مرحلہ کے ریکارڈوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

عام طور پر آرکائیوز کا جو تصور ہے وہ اس اصلی تصور سے وسیع ہے جو اوپر کی سطروں میں بیان ہوا۔ ہر نادر اور تاریخی مخطوطہ، ہر قیمتی تحریر، پتھر اور تانبہ کا کوئی نقش، قدیم حکمراں یا کسی اہم یا نامور شخصیت کا کوئی خط، اس سے قطع نظر کہ وہ کس مقصد کے تحت لکھے گئے اور کن حالات میں ان کو محفوظ رکھا گیا، ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کے باوجود وہ آرکائیوز کے احاطہ سے خارج ہیں۔

انسانی تاریخ کا یہ المناک پہلو بڑا ہی دردناک اور عبرتناک ہے کہ آرکائیوز کا قدیم ترین سرمایہ معدوم ہو چکا ہے۔ اس نقصان اور بربادی کی وجہ سے انسانی تہذیب و ارتقاء کے بے شمار پہلو اب ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ اگر یہ سرمایہ حوادث کا شکار نہ ہوتا تو ان سے مختلف جہت کی رہنمائی حاصل ہوتی۔ اگر اس عظیم نقصان اور بربادی کا صحیح احساس پیدا ہو جائے تو یقیناً جدید آرکائیوز کے قیام کی صحیح قدر و قیمت اور معنویت محسوس کی جائے گی اور اس جانب سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر کسی قسم کی غفلت اور کوتاہی سرزد نہ ہوگی۔

قدومِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

از: مولانا نثیر منصف مظاہری

حقائق کا پیامی، مہبطِ اُمّ الکتاب آیا
وہ آثارِ نبوت لے کے با صد آب و تاب آیا

وہ آیا تو ضلال و جور میں وہ اضطراب آیا
ضیا پھوٹی، فضا بدلی، مبارک انقلاب آیا

وہ آیا تو جہاں میں زندگی کا رنگ و رُو نکھرا
حصولِ خیر و خوبی کا نیا عہدِ شباب آیا

ضلالت کے چھٹے بادل، فضا دل بن گئے روشن
جہانِ انس و جاں میں نورِ حق کا آفتاب آیا

حیاتِ نو ملی، بدلا خیال و فکرِ انسانی
کہ صدرِ بزمِ ہستی صاحبِ فصلُ الخطاب آیا

اطاعت اس کی حسنِ زندگانی کی ضمانت ہے
جہاں میں اسوہ اس کا مرکزِ فیض الکتاب آیا

طمانیت کا درسِ دلکشا جس کا تکلم تھا
وہ دنیا کا مزکّی، شافعِ یوم الحساب آیا

محمد اس کی ہستی ہے، محمد نام ہے اس کا
اسی سے اب برنگِ نو شعورِ احتساب آیا

ستارے جھلملائے، شب گئی، آئی سحر نعمت
یہی تھا وقت جب نورِ دل کا آفتاب آیا

مولانا امین احسن اصلاحی

سند کی عظمت اور اس کے بعض کمزور پہلو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ہو کر چند راویوں کے واسطے سے بتدریج کسی شیخ پر منتہی ہوتی ہے، اس سلسلۂ روایت کو اس حدیث کی سند کہتے ہیں۔ کسی شیخ سے یہاں مراد وہ شیوخِ حدیث ہیں جو سلسلۂ سند میں سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور جن کے ہاتھوں امتِ مسلمہ میں احادیثِ رسول کے مجموعوں کی جمع و تدوین کا عظیم کام زمانہ صدرِ اوّل ہی میں انجام پا چکا ہے، جیسے امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم رحمہم اللہ وغیرہ۔ کتبِ حدیث کی تدوین کے بعد روایتِ حدیث کی سند کے لیے ان اکابر کو شیخ ماننا حدیث کے طالب علموں کے لیے ناگزیر ہے۔

سلسلۂ روایت میں صحابہ کرام کی جو حیثیت اور مرتبہ و مقام ہے اس کی ضروری وضاحت ہم اس سلسلہ کے مضمون 'صحابہ اور صحابیت' کے تحت کر چکے ہیں۔ صحابہ بہرحال اس امت کے گلِ سرسبد ہیں۔ ان کے متعلق یہ طے ہے کہ وہ جرح و تنقید سے قطعی بالاتر ہیں اور محدثین کا یہ اصول کہ 'الصحابة کلهم عدول' (تمام صحابہ جرح و تعدیل سے بالاتر ہیں) ان کے بارے میں بالکل ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کا یہ منصب جو بیان ہوا ہے کہ:

عن عمر بن الخطاب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اصحابي كالنجوم فبايهم اقتديتم اهتديتم[1]

"حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے راہ یاب ہو گے۔"

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، باب مناقب الصحابۃ

اس کا یہ تقاضا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی منسوب کردہ حدیث کے بارے میں یہ دیکھیں کہ وہ پوری امانت و دیانت کے ساتھ روایت کی گئی ہے اور اس کے بارے میں بلا وجہ کسی شبہ میں نہ پڑیں۔

جہاں تک سلسلۂ روایت کے باقی راویوں کا تعلق ہے وہ سب کے سب تنقید کی زد میں آتے ہیں۔ ان سب کی امانت و دیانت، علمی مرتبہ، حافظہ، دین پر عمل، ہر چیز کو پرکھا جاتا ہے اور ائمۂ فن کی ان کے بارے میں آراء کو جمع کیا جاتا ہے۔ اس اہتمام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ روایتِ حدیث میں کوئی خرابی راہ نہ پائے۔ اسی اہم ضرورت نے فنِ اسماء الرجال کی راہ ہموار کی۔

سند کا اہتمام اور فنِ اسماء الرجال کی ایجاد

علمِ حدیث کی حفاظت کے لیے سند کا باقاعدہ اہتمام اور فنِ اسماء الرجال کی ایجاد مسلمانوں کا ایک کارنامہ ہے جس میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جرح و تعدیل کا یہ فن مسلمانوں کا خاص فن ہے۔

جن لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال کی روایت، تحریر اور تدوین کا کام سر انجام دیا ان راویانِ حدیث میں صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے تیسری صدی ہجری تک کے لوگ شامل ہیں جن کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے اور ملنے والوں میں سے کم و بیش بارہ ہزار اشخاص کے نام اور حالات ہمیں ملتے ہیں۔

ان تمام رواۃِ حدیث کے حالات معلوم کرنے اور ان کے طبقات قائم کرنے میں ہزاروں اکابرینِ امت نے اپنی عمریں کھپا دیں۔ وہ قریہ قریہ پہنچے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات مہیا کیں اور جو لوگ خود ان کے عہد میں بقیدِ حیات نہیں تھے ان کے ملنے والوں سے یا ان کے توسط سے ان سے اوپر کے لوگوں سے ان کے حالات دریافت کیے اور جس حد تک انسانی امکان میں ہو سکتا تھا ان حاصل شدہ معلومات کی چھان پھٹک کی۔

اس طرح سے وہ عظیم الشان اور فقید المثال فن معرضِ وجود میں آیا جسے فنِ اسماء الرجال کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت اصحابِ روایتِ حدیث و آثار کے اسماء، القاب، سوانح، سیرت اور امانت و دیانت کا حال قلم بند کیا گیا، ائمہ محدثین کی ان کے بارے میں آراء جمع کی گئیں، ان کی جرح و تعدیل کی گئی اور ان کے طبقات کی تعیین کی گئی۔ گویا جس کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے ساتھ کوئی بات کہنے کی جرأت کی اس کی ساری زندگی نہایت بے لاگ اور بے رحم نقادوں کا ہدف بن گئی اور آخرت سے پہلے اس کو سارا حساب اسی دنیا میں دینا پڑ گیا۔

اس فن میں اگر کوئی قوم مسلمانوں کی حریف ہو سکتی تھی تو وہ اہلِ کتاب ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ اس طرح کا انتظام اپنے نبیوں کے اقوال کی حفاظت کے لیے تو درکنار انھوں نے اپنے آسمانی صحیفوں تک کے لیے نہیں کیا۔ وہ اس میدان میں نہایت ہی بے ہنر نکلے۔ ان کی مذہبی کتابوں کی تو وہ حیثیت بھی نہیں ہے جو ہمارے ہاں ہماری تاریخ کی کتابوں کی ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ کی بھی روایت ملے گی تو اس کی سند موجود ہوگی اور اس کے لیے کوئی معیار بہرحال مطلوب ہوگا۔ لیکن ان کے ہاں ان کی سب سے بڑی کتاب، کتابِ مقدس کے لیے بھی یہ اہتمام نہیں ملتا۔ اسی طرح انجیلیں حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض حواریوں، جیسے لوقا، یوحنا، مرقس وغیرہ سے منسوب تو ہیں لیکن ان کے ان اولین راویوں تک کے اپنے حالات کسی کو معلوم نہیں۔ انجیلوں کی روایت حواریوں سے کس کس نے کی، اس کا تو سرے سے تذکرہ ہی نہیں ملتا۔ جن قوموں نے اپنے آسمانی صحیفوں کی حفاظت میں کمزوری دکھائی وہ اپنے رسولوں کے اقوال کی حفاظت کا بھلا کیا اہتمام کرتیں!

یہاں یہ نکتہ نہایت اہم اور قابلِ توجہ ہے کہ اس زمانہ میں حدیث کے طالب علموں کو جملہ رواۃِ حدیث کے بارے میں جرح و تعدیل کے لیے بہرحال سلف کی تحقیقات ہی پر قناعت کرنی پڑے گی اور مجرد انھی کی تحقیقات کی کسوٹی پر کسی سند کے راویوں کا درجہ متعین کیا جائے گا۔ چنانچہ اب کسی حدیث کی سند کو متقدمین کی فراہم کردہ انھی معلومات کی روشنی میں جانچا پرکھا جائے گا۔ اس لیے کہ ذرائعِ تحقیق مرورِ زمانہ سے اب معدوم ہو چکے ہیں۔ اس میں ہمارے لیے کوئی نئی بنائے قائم کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ ہمارے ان اکابرینِ فن

نے تحقیق کی معراج کی بلندیوں کو چھوا ہے اور انسانی امکان کی حد تک اس فن کی خدمت کی ہے۔

روایت کی جانچ کے لیے سند صرف ایک کسوٹی ہے

سند کو کسی حدیث کے صدق و کذب کے فیصلہ میں ایک اہم بلکہ اولین عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی حدیث کی تحقیق کے لیے سب سے پہلے اس کی سند ہی پر نظر پڑے گی اور اس کے متن پر غور کرنے سے پہلے اس کی جانچ کرنا پڑے گی۔ اس جائزے کی روشنی میں اس روایت کا درجہ متعین کیا جائے گا۔

سند کی اس اہمیت سے انکار کی کسی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن حدیث کے بعض غالی حامیوں کا یہ خیال ہے کہ کسی حدیث کی صحت کے ثبوت کے لیے مجرد اس کی سند کا علم اصول کے معیار پر پورا ہونا کافی ہے۔ یعنی ان کے نزدیک صحتِ حدیث کے لیے صرف سند کی صحت اور اس کا قابلِ اعتماد ہونا فیصلہ کن امر ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ یہ غلو پر مبنی اور محض حسنِ ظن ہے۔ یہ سلف کی ساری تحقیقات، جن کا ہم نے اوپر اجمالی خاکہ پیش کیا، کو گہنا دیتا ہے۔ اس لیے اس مسئلے پر ہم ذرا تفصیلی بحث کریں گے۔

سند کے تمام محاسن، لطائف، عظمت، اہمیت اور اس کے مطابقِ معیار ہونے کے باوجود اس میں بعض ایسے فطری خلا رہ جاتے ہیں جن کی تلافی کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کی صحت کو جانچنے کے لیے سند کے سوا بعض دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جائیں۔ مجرد سند پر اعتبار کر کے کسی روایت کی صحت اور جس واقعے سے متعلق ہو پوری طرح سے اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو آپ مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہمیں کسی درخت کی تحقیق مقصود ہو تو محض اس کی جڑ کی کیفیت کا مطالعہ کافی نہیں ہوگا، بلکہ جڑ کے علاوہ اس کے تنے، ٹہنیوں، پتّوں اور پھل وغیرہ کا بھی گہرا جائزہ لینا پڑے گا تب کہیں جا کر اس درخت سے متعلق ہم جامع اور حتمی رائے قائم کر سکیں گے۔

سند کا پہلا خلا

سند کی تحقیق میں جو خلا باقی رہ جاتے ہیں وہ معمولی غور و تدبر سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً

پہلا خلا اس میں یہ ہے کہ اپنے حلقہ اور علاقہ سے بعید ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کے عقیدہ و کردار، ان کے علم و عمل اور ان کے تعلقات و معاملات کی ایسی تحقیق کہ ان کے متعلق یہ طے کیا جا سکے کہ علمِ رسول کے حمل و نقل کے باب میں ان پر اطمینان کیا جا سکتا ہے یا نہیں، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بے شک محدثین نے اس میدان میں بڑی جاں فشانیاں کی ہیں، لیکن یہ کام ہے بہت مشکل۔ اس نوعیت کی تحقیق اگر ہم اپنے گاؤں یا قصبہ یا شہر کے لوگوں کے بارے میں کرنا چاہیں تو چنداں آسان نہیں، چہ جائے کہ ہزاروں میل دور کے لوگوں کے بارے میں جو مختلف ادوار میں پھیلے ہوئے ہوں۔ اس قسم کی تحقیق کے بارے میں متضاد رائے یہ ہو سکتی ہے کہ فی الجملہ ہمیں ان لوگوں کے کوائف معلوم ہیں اور اب ان کی شخصیات مجہول نہیں رہیں۔ ان کے بارے میں کسی رائے کو حتمی و قطعی کہنا مشکل اور غالباً اپنی معلومات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہے۔

آدمی کے کردار و اخلاق کے معاملے میں قابلِ اطمینان رائے اسی صورت میں قائم کی جا سکتی ہے جب معاملات میں اس سے عملاً سابقہ پڑا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صاحبِ علم و فراست کی رائے یہی ہے۔ ان کی نسبت مشہور ہے کہ ایک صاحب نے ان کے سامنے کسی دوسرے شخص کی تعریف کی تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارا اس کے ساتھ کبھی پڑوس رہا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب انھوں نے پوچھا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی تجارتی سفر کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا کہ تب تمہیں اس کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آدمی کسی کے ساتھ کوئی معاملہ نہ کرے، اس کے ساتھ کسی کاروبار یا تجارت میں شریک نہ رہا ہو، اس کے ساتھ سفر نہ کیا ہو، اس کا پڑوسی نہ رہا ہو، ربط ضبط کا ماحول نہ رہا ہو تو اس کے بارے میں واقعہ یہ ہے کہ آسانی کے ساتھ رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ ان حالات میں بعض اوقات ایک ذہین و فطین آدمی بھی دھوکا کھا سکتا ہے۔

سند کا دوسرا خلا

سند کی تحقیق میں دوسرا خلا جرح و تعدیل کے کام کی نزاکت سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر محقق

یہ نہیں جانتا کہ جرح کس چیز پر ہونی چاہیے اور تعدیل کس چیز کی ہونی چاہیے۔ یعنی یہ جاننا کہ کیا باتیں جرح کے حکم میں داخل ہیں اور کیا باتیں تعدیل کے مقتضیات میں سے ہیں ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ کردار کی اساسات کیا ہیں، بدکرداری کی بنیادیں کیا ہیں، یہ چیزیں اتنی آسان نہیں کہ ہر خاص و عام اس کا کما حقہ ادراک کر سکے۔ اس بے خبری کی مثالیں ماضی میں رہی ہیں اور خود مشائخ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ موجودہ دور کے غلوئے عقیدت و نفرت سے اس مشکل کا ایک سرسری اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جرح و تعدیل کا کام علم، فقاہت، بصیرت، تجربے اور مقبولیت کا متقاضی ہے۔ انسان ہمیشہ انسان ہی رہے ہیں فرشتے نہیں رہے ہیں۔ فنِ اسماء الرجال کے ماہرین کا معیارِ اخلاق بصیرت و بصارت بے شک ہم سے اونچا رہا ہے لیکن وہ بہرحال آدمی ہی تھے۔ رواۃ حدیث کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات اور ان پر مبنی آراء عام انسانی جبلت میں موجود تعصب کے شائبہ سے پاک نہیں ہو سکتیں جو حق یا مخالف رو عموماً لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

جرح و تعدیل کے فن کے مقتضیات میں سے ہے کہ کسی کے متعلق معلومات فراہم کرنے والا شخص جتنا اچھا ہونا چاہیے اور اس سے زیادہ جچا تلا متوازن اور زیرک اس کو ہونا چاہیے جو جرح و تعدیل کرتا ہے۔

ہمارے نزدیک، جرح و تعدیل کے کام کی مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے محتاط طرزِ عمل یہ ہے کہ سلسلۂ روایت یعنی سند کے راویوں کے متعلق اس فن کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ہی اجمالاً ایک رائے قائم کی جائے لیکن اس رائے کو قطعیت کا یہ رنگ نہیں دیا جا سکتا کہ کسی حدیث کی صحت کا معیار اسی رائے کو ٹھہرا لیا جائے۔

سند کا تیسرا خلا

سند کی تحقیق میں تیسرا خلا یہ ہے کہ ہمارے ائمہ نے اہلِ بدعت، خصوصاً شیعہ اور روافض سے روایات لینے میں بڑی سماحت برتی ہے۔ یہ لوگ دوسرے معاملات میں تو بڑے بیدار ثابت ہوئے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں انھوں نے واقعی چشم پوشی سے کام لیا۔ امام

مالک علیہ الرحمۃ سے متعلق تو بے شک اس معاملے میں احتیاط منقول ہے، لیکن دوسرے تمام ائمہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابو حنیفہ، قاضی ابو یوسف، امام مسلم علیہم الرحمۃ وغیرہ کے متعلق صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اہلِ بدعت سے روایات لینے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔ بس اتنی احتیاط فرماتے تھے کہ ان کے خیال میں وہ اپنی بدعت کا باقاعدہ داعی نہ ہو۔ گویا ان کے نزدیک محض بدعتی سے روایات لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ از روئے قرآن، از روئے حدیث اور حدیث کے مجموعی مزاج کے تقاضے کے لحاظ سے مجرد اہلِ بدعت کے گروہ سے ہونا ضعف کے لیے کافی ہے، اگرچہ راوی اپنی بدعت کا داعی نہ رہا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعیت، رفض، باطنیت، اور اس قبیل کے دوسرے مذاہب اصل دین سے انحراف پر قائم ہیں۔ اپنے مذہب کو ثابت کرنے کی خاطر جب تک یہ اصل دین میں جھوٹ نہ بولیں تو اپنا گروہی فریضہ نہیں ادا کرتے۔ انھیں اپنی بدعت کے حق میں دلیل فراہم کرنے کے لیے روایات کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے اور ان کے لیے روایات میں خیانت کے سوا کوئی چارہ نہیں کیوں کہ ان کے مذاہب بہرحال بدعت ہی کے اوپر قائم ہیں۔ کسی ماثور حقیقت کے اوپر قائم نہیں ہیں۔ سوادِ امت سے ان فرقوں کا اختلاف کسی ایک آدھ بات یا چند جزئیوں کی توجیہ میں نہیں ہے بلکہ بیشتر دین کے مآخذ میں اختلاف ہے جس سے ان کا مذہب بالکل الگ ہو گیا ہے۔ اب اگر کسی کو ان فرقوں کے ساتھ صلح کل کے فلسفے کو نبھانا اور بھائی چارہ اور دوستی قائم کرنا ہو تو وہ ضرور ہو جا سکے، لیکن دین کے معاملے میں اس باطل فلسفے کو راہ نہیں دی جا سکتی۔

ہمارے نزدیک اہلِ بدعت کی روایات قبول کرنے کی یہ گنجائش فتنوں کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے اور اسی میں اس کا باعث بنی ہے۔ مجرد کسی کا مبتدع ہونا اس کے ساقط الاعتبار ہونے کے لیے کافی ہے اور ان فرقوں میں سے کسی کی روایت قابلِ قبول نہیں ہونی چاہیے خواہ وہ قسم کھا کے روایت کرے کہ میں سچ ہی روایت کر رہا ہوں گا۔ ہمارے نزدیک یہی صحیح مسلک ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہے۔

سند کا چوتھا خلا

مسئلے کی تحقیق میں چوتھا نکتہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر محدثین نے حلال وحرام کے متعلق حدیثیں قبول کرنے میں تو انتہائی احتیاط برتی ہے لیکن ترغیب وترہیب اور فضائل وغیرہ کی روایات میں انھوں نے عمداً تساہل برتا ہے۔ الکفایۃ فی علم الروایۃ میں امام احمد بن حنبل کا قول نقل ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اذا روینا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الحلال والحرام والسنن والاحکام تشددنا فی الاسانید، واذا روینا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی فضائل الاعمال وما لا یضع حکماً ولا یرفعہ تساھلنا فی الاسانید۔[1]	"جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال وحرام اور سنن واحکام کے بارے میں روایت کرتے ہیں تو سند کے معاملے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں لیکن جب معاملہ فضائلِ اعمال وغیرہ کا ہو جس سے نہ کوئی حکم قائم ہوتا ہو نہ کوئی حکم منسوخ ہوتا ہو تو اس کی سند میں ہم تساہل برتتے ہیں۔"

گویا محدثین نے سند کی صحت کو صرف ان روایات کے ضمن میں درخورِ اعتنا سمجھا جن میں کسی نوعیت کے احکام تھے۔ ترغیب وترہیب کی کمزور روایات کو مفید سمجھا گیا کہ ان کے باعث لوگ نیکی کی طرف رجوع کریں۔ فضائل کی روایات سے بھی نیکی کے عمل کو تحریک ملتی تھی۔ اس لیے ان کو سند کے ضعف کے باوجود کتابوں میں جگہ دے دی گئی۔ لیکن ہمیں یہ جائزہ لینا چاہیے کہ آیا محدثین ایسا کرنے میں حق بجانب تھے یا نہیں۔

نہایت عمیق مطالعے اور غور وفکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاں تک اہلِ تصوف کے اصل دین سے انحراف پر مبنی خیالات اور تصوراتِ اعمال کا تعلق ہے، یہ بیشتر محدثین کی لاپروائیوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کمزور روایات کا ایک دفتر کھول دیا جس سے کئی نئے تصوراتِ دین نے جنم لے لیا۔ گویا انھوں نے اصلاحِ اعمال کا سبب ہی کمزور روایات کو بنا دیا، بلکہ ان روایات سے عقائد

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب التشدد فی احادیث الاحکام والتجوز فی فضائل الاعمال: ص ۱۳۳۔

بھی متاثر ہوئے اور یہ رو اس قدر بڑھی کہ دین کے نام سے نئے عقائد، نئے اعمال اور نئے اخلاق اختیار کر لیے گئے۔ جب اہلِ تصوف کے ان احمقانہ تجاوزات کو محدثین نے ان کی بے سروپا قرار دیا اور ان کے خیالات پر گرفت کی تو معلوم ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اس لیے جواب میں انھیں یہ طعنہ دیا گیا کہ محدثین کا کام تو راویوں کی غیبت کرنا ہے اور ان کا جرح وتعدیل کا کام اس حرام کام کے ارتکاب پر مبنی ہے۔ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ تصوف نے محدثین کے انتباہ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس طرح محدثین کا یہ خیال کہ اگر وہ حلال وحرام اور سنن واحکام کے بارے میں احتیاط کریں گے اور ترغیب وترہیب اور فضائلِ اعمال وغیرہ سے متعلق روایات میں تساہل برت لیں گے تو اس سے دین پر اس کے برے اثرات نہیں پڑیں گے، بالکل غلط بلکہ مہلک ثابت ہوا۔

فی الحقیقت روایات میں اس تساہل کے نتیجے میں کمزور روایات کی بھرمار تصوف کی کتابوں میں ہو گئی ہے اور ان سے دین کا تصور جس قدر مسخ ہوا ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان کی بدولت دین کا ایک متوازی تصور قائم ہو گیا جس کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل میں کہیں نہیں ملتی۔

خلاصۂ بحث

کسی حدیث کے صدق وکذب کے فیصلے میں سند کے ایک اہم عامل ہونے سے انکار کی گنجائش تو کسی کے لیے نہیں ہے، لیکن اس کے لطائف، محاسن، عظمت اور اس کے مطابقِ معیار ہونے کے باوجود سند کی تحقیق میں بعض ایسے خلا رہ گئے ہیں جن کے باعث سند کو روایت کی صحت کے جانچنے کا واحد ذریعہ قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ یہ ضروری ہے کہ تحقیق کے لیے آج بھی نہ صرف سند کو مزید پرکھنے کی کوشش کی جائے، بلکہ اس کے علاوہ وہ تمام فطری طریقے اختیار کیے جائیں جن سے روایت کی حیثیت متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ اشراق لاہور)

دوسری قسط ———— عین الحق قاسمی
ایم۔ اے (علیگ)
جامعۃ الفلاح بلریاگنج

جاہلی شاعری کا مطالعہ

جاہلی دور کے شعراء

یہاں جاہلی دور کے تمام شعراء کا احاطہ مشکل ہے۔ مشہور عربی ادیب جرجی زیدان نے ان کی تعداد سو سے زیادہ بتائی ہے جن میں اکثر چھٹی صدی عیسوی کے ہیں۔ مجموعی تعداد میں بعض شعراء ایسے ہیں جنہوں نے اسلام کا زمانہ بھی پایا[1] اور اس میں مشہور بھی ہوئے۔ ایسے شعراء کو "مخضرمی" کہا جاتا ہے۔

ابن سلام الجمحی کے مطابق مشہور جاہلی شعراء کی تعداد چالیس ہے جن کو دس طبقات میں تقسیم کیا ہے ہر طبقہ میں چار ۴ شعراء کو رکھا ہے[2]

ترتیب یہ ہے:۔

۱۔ **پہلا طبقہ** امرؤ القیس، النابغۃ الذبیانی، زہیر بن ابی سلمی، الاعشی۔

۲۔ **دوسرا طبقہ** اوس بن حجر، بشر بن ابی خازم، کعب بن زہیر، الحطیئۃ۔

۳۔ **تیسرا طبقہ** النابغۃ الجعدی، ابو ذؤیب الہذلی، الشماخ بن ضرار، لبید بن ربیعۃ

۴۔ **چوتھا طبقہ** طرفۃ بن العبد، عبید بن الابرص، علقمہ بن عبدۃ، عدی بن زید

۱۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج ۱ ص ۹

۲۔ مقدمہ طبقات فحول الشعراء، تحقیق محمود محمد شاکر، ص ۲۴ مطبعۃ المدنی قاہرہ

۵۔ **پانچواں طبقہ** خداش بن زہیر، الاسود بن یعفر، المخبل السعدی، تمیم بن ابی مقبل

۶۔ **چھٹا طبقہ** عمرو بن کلثوم، الحارث بن حلزۃ، عنترہ بن شداد، سوید بن ابی کاہل

۷۔ **ساتواں طبقہ** سلامۃ بن جندل، حصین بن الحمام المری، المتلمس، المسیب بن علس

۸۔ **آٹھواں طبقہ** عمرو بن قمیئۃ، النمر بن تولب، اوس بن غلفاء، عوف بن عطیۃ بن الخرع

۹۔ **نواں طبقہ** ضابئ بن الحارث البرجمی، سوید بن کراع، الحویدرۃ، سحیم عبد بنی الحسحاس

۱۰۔ **دسواں طبقہ** امیۃ بن حرثان بن الاسکر، حریث بن محفض، الکمیت بن معروف، عمرو بن شاس

اصحاب معلقات

مذکورہ بالا تمام شعراء ... یوں اپنی جگہ بہت اہم ہیں، مگر ان میں سب سے زیادہ مقبول و مشہور وہ ہیں جنہوں نے "معلقات" کہے۔ تقریباً تمام ادباء و ناقدین کا اس پر اتفاق ہے کہ اصحاب معلقات کو تمام جاہلی شعراء پر ہر اعتبار سے فوقیت و برتری حاصل ہے۔ چنانچہ احمد حسن الزیات لکھتے ہیں کہ:

"وہ انچاس[1] قصیدے جنہیں ابو زید قرشی نے "جمہرۃ اشعار العرب" میں جمع کیا ہے، قدیم شاعری کی سب سے زیادہ صحیح روایت ہیں، وہ جاہلی شاعری کے طرز و انداز اور اسلوب و بیان کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں، پھر ان میں بھی با اعتبار روایت سب سے زیادہ مستند، بلحاظ حفاظت و صیانت سب سے محفوظ وہ معلقات یا مذہبات یا سموط ہیں جن کے متعلق غالب رائے یہ ہے کہ وہ سات قصائد ہیں، جو تمام مورخین کے خیال کے مطابق عربوں کے منتخب اور پسندیدہ قصائد تھے جنہیں آب زر سے وصلیوں پر لکھوا کر اظہار شغف و دلبستگی، دوامی شہرت کے لئے خانہ کعبہ پر آویزاں کر دیا گیا تھا"[2]

۱۔ تاریخ الادب العربی ص ۲۴

پھر اس میں بڑا اختلاف ہے کہ وہ قصیدے خانۂ کعبہ پر لٹکائے گئے تھے یا نہیں؟[1] حقیقت جو کچھ ہو بہر حال اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ یہ قصیدے جاہلی شاعری کے ایسے شاہکار تھے جنھیں زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جاتا۔

اصحاب معلقات کی تعداد بھی مختلف فیہ ہے چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ ان کی تعداد سات ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کی تعداد دس[2] ہے۔ معلقات کے راوی حماد الراویہ اور صاحب الجمہرۃ کے نزدیک ان کی تعداد سات ہے جن[3] کے نام یہ ہیں:

امرؤ القیس، زہیر، طرفہ، لبید، عمرو بن کلثوم، حارث بن حلزۃ، عنترہ۔ صاحب جمہرۃ نے حارث بن حلزہ اور عنترہ کے بجائے اعشیٰ اور نابغہ ذبیانی کو رکھا ہے۔[3]

اب ہم مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ان میں سے چند کا اجمالی تذکرہ کریں گے۔

امرؤ القیس

اس کا نام جندح بن حجر کندی ہے۔ یہ نسلاً قحطانی یمنی تھا۔ اسے الملک الضلیل (گمراہ بادشاہ) اور ذو القروح (زخموں والا) بھی کہتے ہیں۔ اس کی کنیت ابو وہب اور لقب امرؤ القیس ہے۔ یہ نجیب الطرفین یعنی ماں اور باپ دونوں جانب سے شاہی خاندان کا فرزند تھا۔ اس کا باپ حجر بنو اسد کا آخری بادشاہ اور ماں فاطمہ ربیعہ سردار کی لڑکی اور قبیلہ تغلب کے نامور شاعر مہلہل اور کلیب کی بہن تھی۔

شاعری

جہاں تک امرؤ القیس کی شاعری کا سوال ہے تو یہ جاہلی شعراء

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے، مراجع مذکورہ و تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان ج ۱ و تاریخ الادب العربی، العصر الجاہلی، شوقی ضیف ص ۱۴۰، دار المعارف، مصر

[2] شوقی ضیف: تاریخ الادب العربی (العصر الجاہلی) ص ۱۴۶

[3] ایضاً ایضاً

میں سب سے ممتاز اور نمایاں ہے ...... جیسا کہ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "اشعر الشعراء وقائدهم الی النار" (سب شاعروں سے اچھا اور ان کو جہنم کی طرف لے جانے والا) ہے۔ شاید اس کو الملک الضلیل (گمراہ بادشاہ) اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو عشق و شراب اور لہو و لعب میں برباد کر ڈالا تھا۔ اس کی شاعری بڑی حد تک ایک داستان عیش و نشاط ہے اور اس داستان کا ہر گوشہ رعنائی خیال، مستی، شوق اور رنگینی بیان کا ایک دلکش مرقع ہے۔ عشق میں گھٹن اور گھٹ گھٹ کے مرنا اس کا شیوہ نہیں بلکہ اس سے بھرپور لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کی زندگی پروانے کی نہیں بھونرے کی سی ہے۔ جس کا کام ہر گلِ نو دمیدہ پر منڈلانا ہے۔ وہ غالب کی طرح اس بات کا قائل ہے کہ:

اسد بہارِ تماشائے گلستانِ حیات　　وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

اس کی شاعری اس کی پوری زندگی اور اخلاق و عادات کی آئینہ دار ہے۔ اس کی زندگی میں شاہانہ شان و شوکت بھی ہے، فقیرانہ تواضع و مسکنت بھی، قومی غیرت و حمیت بھی ہے، آوارگی و مستی بھی۔ اور اسی طرح کی دیگر گوناگوں صفات کی وجہ سے اس کی شخصیت بہت متنوع ہے۔

اس کے اشعار میں تنوع مضامین، حسن وصف، منظر کشی، دقت معانی، حسن بیان اور پر زور الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں جن سے وہ ممتاز اور منفرد سمجھا جاتا ہے۔ جیسے:

۱۔ یہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے دوستوں سے محبوبہ کے چھوٹے ہوئے دیار پر ٹھہرنے اور اس کی یاد میں کچھ دیر رونے کی خواہش ظاہر کی۔

۲۔ نادر تشبیہات کا استعمال کیا، مثلاً عورتوں کو نیل گایوں اور گورے رنگ کو شتر مرغ کے انڈے سے تشبیہ دی۔

۳۔ وصف بیان میں اس نے محبوبہ، گھوڑے، رات اور باد و باراں کا جو نقشہ کھینچا

جب کہ پوری جاہلی شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی ۔

۲- اسی نے سب سے پہلے متعدد عورتوں سے اظہارِ عشق کیا اور اس میں بڑی بے حیائی اور ڈھیٹ پن کا ثبوت دیا ۔

نمونۂ کلام

اس کی شاعری کا سب سے شاہکار نمونہ اس کا وہ معلقہ ہے جو لوگوں میں ضرب المثل ہے جسے اس نے اپنی چچا زاد بہن عنیزہ کے عشق میں لکھا ہے ۔ یہ قصیدہ لامیہ ہے اور بحرِ طویل سے ہے ۔ اس میں کم و بیش اکیاسی اشعار ہیں ۔

مطلع یہ ہے :

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَىٰ حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ ‏ ‏ ‏ ‏ بِسِقْطِ اللِّوَىٰ بَيْنَ الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

اے میرے دونوں رفیقو! ذرا ٹھہر جاؤ تاکہ ہم محبوب اور اس کے مکان کو یاد کر کے رو لیں جو کبھی دخول اور حومل کے درمیان ریتیلی زمین میں واقع تھا ۔

مرکزی مضامین

اس قصیدہ کے مرکزی مضامین حسبِ ذیل ہیں ۔ غزل یا تشبیب، رات کا وصف، گھوڑے کی تعریف، بادل بجلیوں کی توصیف (برق و باراں)۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا مختصر جائزہ لیں گے ۔

غزل یا تشبیب

اس قصیدے کا نصف اول غزلیہ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان اشعار میں امرؤ القیس نے کمالِ فنکاری کا ثبوت دیا ہے ۔ اس کا کلام گو جاہلی شاعری کی معراج ہے تو بے حیائی اور فحاشی کا اعلیٰ نمونہ بھی ۔ کچھ اشعار تو ایسے ہیں جن میں کھلم کھلا فحاشی کی گئی ہے ۔ تاہم بہت سے ایسے اشعار بھی ہیں جن کو نفسِ غزل کے رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

محبوب سے جدائی کے وقت اپنی حالت کی کیفیت کو کتنی عمدہ اور لطیف تشبیہ میں

بیان کیا ہے :

كَأَنِّي غَدَاةَ الْبَيْنِ يَوْمَ تَحَمَّلُوا ‏ ‏ ‏ ‏ لَدَىٰ سَمُرَاتِ الْحَيِّ نَاقِفُ حَنْظَلِ

جدائی کے دن جب محبوب کے ہمراہیوں نے کوچ کیا تو میں قبیلہ کے کیکروں کے پاس اس حالت میں تھا جیسے اندرائن کے پھل توڑنے والا (کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں ایسے ہی میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے)

ایک جگہ اپنی محبوبہ سے یوں مخاطب ہے :

أَفَاطِمُ مَهْلًا بَعْضَ هَٰذَا التَّدَلُّلِ ‏ ‏ ‏ ‏ وَإِنْ كُنْتِ قَدْ أَزْمَعْتِ صَرْمِي فَأَجْمِلِي

أَغَرَّكِ مِنِّي أَنَّ حُبَّكِ قَاتِلِي ‏ ‏ ‏ ‏ وَأَنَّكِ مَهْمَا تَأْمُرِي الْقَلْبَ يَفْعَلِ

فَإِنْ كُنْتِ قَدْ سَاءَتْكِ مِنِّي خَلِيقَةٌ ‏ ‏ ‏ ‏ فَسُلِّي ثِيَابِي مِنْ ثِيَابِكِ تَنْسُلِ

وَمَا ذَرَفَتْ عَيْنَاكِ إِلَّا لِتَضْرِبِي ‏ ‏ ‏ ‏ بِسَهْمَيْكِ فِي أَعْشَارِ قَلْبٍ مُقَتَّلِ

ترجمہ : اے فاطمہ! اپنے یہ ناز و انداز چھوڑ، اور اگر تو نے مجھ سے قطع تعلق کا ارادہ کر لیا ہے تو خوبصورتی سے اس کی تکمیل کر ڈال ۔

کیا تجھے میری جانب سے اس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے کہ تمہاری محبت مجھے مار ڈالے گی، اور جب تم میرے دل کو کوئی حکم دو گی تو وہ مان لے گا ۔

اور اگر تم کو میری کوئی عادت بری لگی تو تم اپنے کپڑے مجھ سے الگ کر لو وہ الگ ہو جائیں گے ۔

اور تیری آنکھیں اس لئے اشک ریز ہوئیں تاکہ میرے زخمی دل کے گوشے میں نینوں کے بان چلائیں ۔

رات کا وصف

حسن و عشق کے باب میں رات کی تاریکی اور درازی کا ذکر بھی خاص اہم ہے ۔ امرؤ القیس بھی اس تجربہ سے دوچار ہوا ہے ۔ ملاحظہ ہو اس نے کتنی صبر آزما اور مشکل راتیں گزاری ہیں :

وَلَيْلٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ أَرْخَى سُدُولَهُ   عَلَيَّ بِأَنْوَاعِ الْهُمُومِ لِيَبْتَلِي

میری آزمائش کے لیے سمندر کی موجوں کے مانند بہت سی راتوں نے مجھ پر غم واندوہ کے پردے ڈالے،

آگے رات کی درازی سے اکتا کر اپنی بے چینی اور کرب کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

فَقُلْتُ لَهُ لَمَّا تَمَطَّى بِصُلْبِهِ   وَأَرْدَفَ أَعْجَازًا وَنَاءَ بِكَلْكَلِ

جب رات نے اپنا سینہ اٹھایا، پشت درازی اور سرین پیچھے نکالے تو میں نے اس سے کہا:

أَلَا أَيُّهَا اللَّيْلُ الطَّوِيلُ أَلَا انْجَلِي   بِصُبْحٍ وَمَا الْإِصْبَاحُ مِنْكَ بِأَمْثَلِ

اے شب دراز فراق، تو سپیدۂ صبح سے روشن و منور کیوں نہیں ہوتی، سحر نہیں! تیری صبح روشن ہو گئی تب بھی اچھا نہیں (کہ یہاں تو نہ رات میں چین ہے نہ دن میں)

فَيَا لَكَ مِنْ لَيْلٍ كَأَنَّ نُجُومَهُ   بِأَمْرَاسِ كَتَّانٍ إِلَى صُمِّ جَنْدَلِ

تعجب ہے کہ یہ کیسی رات ہے؟ گویا اس کے ستارے سن کی رسیوں سے ٹھوس پتھروں میں باندھ دیئے گئے ہیں۔

گھوڑے کی تعریف

امرؤالقیس نے اپنے گھوڑے کی بہت تعریف کی ہے چونکہ وہ شہزادہ تھا اس لئے اس کا گھوڑا بھی شاہی شان وشوکت کا نشان رہا ہوگا، حقیقت بھی کچھ یہی ہے: ملاحظہ ہو:

وَقَدْ أَغْتَدِي وَالطَّيْرُ فِي وُكُنَاتِهَا   بِمُنْجَرِدٍ قَيْدِ الْأَوَابِدِ هَيْكَلِ

پرندے ابھی اپنے گھونسلوں ہی میں ہوتے ہیں کہ میں صبح کم بال والے گھوڑے پر سوار ہوتا ہوں جو وحشی جانوروں کو پابند گرفت میں لینے والا، قوی ہیکل ہے۔

مِكَرٍّ مِفَرٍّ مُقْبِلٍ مُدْبِرٍ مَعًا   كَجُلْمُودِ صَخْرٍ حَطَّهُ السَّيْلُ مِنْ عَلِ

وہ بیک وقت اس تیزی سے آگے بڑھتا ہے، پیچھے ہٹتا ہے، بھاگتا ہے اور حملہ کرتا ہے

کہ جیسے کوئی بھاری پتھر ہے جسے سیلاب کی رو اوپر سے نیچے لڑھکا دے۔

كُمَيْتٍ يَزِلُّ اللِّبْدُ عَنْ حَالِ مَتْنِهِ   كَمَا زَلَّتِ الصَّفْوَاءُ بِالْمُتَنَزَّلِ

وہ سرخ سیاہ رنگ کا گھوڑا ایسا ہے کہ نمدہ اس کی پیٹھ سے اس طرح پھسلتا ہے جس طرح صاف چکنا پتھر اپنی فرودگاہ سے پھسلتا ہے،

نیل گایوں کی توصیف

امرؤالقیس جب گھوڑے پر سوار ہو کر حالتِ سفر میں ہوتا ہے تو راستے میں اسے بہت سے جنگلی جانوروں کا سامنا ہوتا ہے جن میں نیل گاؤں کا ذکر وہ خصوصیت سے کرتا ہے۔ اس کے لئے وہ بہت ہی زریں تشبیہات کا استعمال کرتا ہے، انداز بھی بہت انوکھا ہے، ملاحظہ فرمائیں! نیل گایوں کو دوار بت کے اردگرد طواف کرنے والی دوشیزاؤں سے مشابہت دی ہے۔

فَعَنَّ لَنَا سِرْبٌ كَأَنَّ نِعَاجَهُ   عَذَارَى دَوَارٍ فِي مُلَاءٍ مُذَيَّلِ

پھر ہمارے سامنے جانوروں کا ایک جھنڈ آیا، جنگلی نیل گائیں ایسی تھیں جیسی دوار کی وہ کنواریاں جو لمبی چادروں میں (اس کا طواف کر رہی) ہوں۔ آگے نیل گایوں کو یمنی مہروں سے تشبیہ دیتا ہے۔

فَأَدْبَرْنَ كَالْجِزْعِ الْمُفَصَّلِ بَيْنَهُ   بِجِيدٍ مُعَمٍّ فِي الْعَشِيرَةِ مُخْوَلِ

ان نیل گایوں نے ہم کو دیکھا تو پیچھے کو بھاگیں جیسے وہ سیاہی و سفیدی میں یمنی مہرے ہوں جن کے بیچ میں (سونے چاندی کے منکوں سے) فاصلہ ڈالا گیا ہو اور وہ قوم کے کسی معزز آدمی کی گردن میں ڈالا گیا ہو۔

برق و باراں

حالتِ سفر میں وہ رعد و برق اور باد و باراں سے بھی نہیں گھبراتا بلکہ ان سے لطف اندوز ہوتا ہے، چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بجلی کے چمکنے کا تماشہ بڑے شوق سے دیکھتا ہے، کہیں بجلی کی چمک کی مثال ہاتھوں کی حرکت سے دیتا ہے،

کسی پادری کے چراغ سے۔ ملاحظہ ہو۔

أَصَاحِ تَرَىٰ بَرْقاً أُرِيكَ وَمِيضَهُ ... كَلَمْعِ الْيَدَيْنِ فِي حَبِيٍّ مُكَلَّلِ

اے میرے دوست! تو اس بجلی کو دیکھتا ہے جس کی چمک سخت گھرے بادل
میں دونوں ہاتھوں کے چمکنے کی طرح ہے۔

يُضِيءُ سَنَاهُ أَوْ مَصَابِيحُ رَاهِبٍ ... أَمَالَ السَّلِيطَ بِالذُّبَالِ الْمُفَتَّلِ

یہ بجلی کی روشنی چمکتی ہے یا اس راہب کے چراغ کی جس نے خوب بٹی ہوئی بتی
پر روغن انڈیل دیا ہو۔

آگے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مختلف مقامات اور پہاڑوں پر طوفانی بارش کا ذکر بھی بڑے بلیغ انداز میں کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

فَأَضْحَىٰ يَسُحُّ الْمَاءَ فَوْقَ كُتَيْفَةٍ ... يَكُبُّ عَلَى الْأَذْقَانِ دَوْحَ الْكَنَهْبَلِ

اس گھٹا نے مقام کتیفہ پر ایسا پانی برسایا کہ کنہبل جیسے بڑے بڑے درخت
کو منہ کے بل گرا دیا۔

وَمَرَّ عَلَى الْقَنَانِ مِنْ نَفَيَانِهِ ... فَأَنْزَلَ مِنْهُ الْعُصْمَ مِنْ كُلِّ مَنْزِلِ

اور قنان پہاڑ پر اس کی بارش کی پھوار پڑی جس نے اس پہاڑ سے پہاڑی بکروں
کو ہر جگہ سے اتار دیا۔

كَأَنَّ ثَبِيراً فِي عَرَانِينِ وَبْلِهِ ... كَبِيرُ أُنَاسٍ فِي بِجَادٍ مُزَمَّلِ

بارش جب شروع ہوئی تو ثبیر پہاڑ کی حالت قوم کے اس سردار کی سی تھی جو دھاری دار
کمبل اوڑھے ہوئے ہو۔

مجموعی جائزہ

بحیثیت مجموعی امرؤ القیس کے معلقہ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ پورا معلقہ حالتِ سفر کی داستان ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی ابتداء محبوبہ کے اجڑے دیار میں پہونچ کر کچھ دیر ٹھہرنے اور اس کی

یاد میں رونے سے ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر سفر کی حالت میں ہے، پھر وہ آگے بڑھتا ہے اور دوسری معشوقاؤں سے ملتا ہے، اسی میں دارۂ جلجل کا وہ مشہور واقعہ پیش آتا ہے جس میں شاعر کی حیثیت گوپیوں میں کنہیا کی ہو جاتی ہے، وہ ان کے ساتھ خوب دادِ عیش دیتا ہے، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ حسن و عشق کا یہ دلدادہ شاعر اپنے گھوڑے پر سوار رات دن آوارہ گردی میں مصروف ہے،

دورانِ سفر وہ رات کی تاریکی، بجلی کی کڑک اور بارش کی شدت سے بالکل نہیں گھبراتا، بلکہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے، راستے میں جنگلی جانوروں کے علاوہ نیل گایوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہے، وہ انھیں بڑی دلچسپی سے دیکھتا ہے اور کبھی کبھی ان کا شکار بھی کرتا ہے۔ ان سب چیزوں کا ذکر وہ اپنے اشعار میں بڑی خوبصورتی سے کرتا ہے، جس کا ہلکا سا نمونہ ہم نے گزشتہ صفحات میں پیش کیا۔ اب ہم جاہلی دور کے ایک دوسرے شاعر زہیر کا ذکر کریں گے۔

زہیر بن أبی سُلمیٰ

اس کا پورا نام زہیر بن ابی سُلمیٰ بن ربیعہ بن رباح المزنی ہے، یہ پیدائشی شاعر ہے کیونکہ اس کا پورا گھرانہ شعر و ادب سے گہرا شغف رکھتا تھا، چنانچہ اس کا باپ ربیعہ، سوتیلا باپ اوس بن حجر، دونوں بہنیں سُلمیٰ اور خنساء، دونوں لڑکے کعب اور بجیر سب شاعر تھے، یہی وجہ ہے کہ شاعری کے میدان میں اس نے بہت جلد ترقی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے معاصرین کو پیچھے چھوڑ گیا، اب وہ شاعر ہی نہیں رہا بلکہ استاذ الشعراء کی حیثیت اختیار کر لی، اس کے شاگردوں میں کعب اور بجیر اور حطیئہ مشہور ہیں[1]۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے اسلام کا زمانہ پایا مگر اسلام قبول نہیں کیا، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام آنے سے کچھ پہلے اس کا انتقال ہوگیا تھا، البتہ اس کے دونوں بیٹوں نے اسلام قبول کیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کعبؓ کا قصیدہ مشہور ہے۔

---

[1] شوقی ضیف، تاریخ الادب العربی، العصر الجاہلی، ص ۲۰۳

شاعری | شاعری میں وہ اپنے سوتیلے اوس بن حجر سے زیادہ متاثر ہوا، اور بڑی حد تک اس کا تتبع بھی کیا۔

اس کی شاعری میں حکمت و فلسفہ اور اخلاقی مضامین کی کثرت ہے۔ وہ خصوصیات جو اس کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اس کا کلام حسن ایجاز کا بہترین مرقع ہے۔
۲۔ اس کے یہاں غیر ضروری اور فضول باتوں سے احتراز پایا جاتا ہے۔
۳۔ سوقیانہ مضامین اور پھکڑپن سے پاک ہے۔
۴۔ غریب اور نامانوس الفاظ کا استعمال نہیں کرتا۔
۵۔ ضرب الامثال اور حکیمانہ جملے بہت ملتے ہیں۔
۶۔ کسی کی جھوٹی تعریف نہیں کرتا۔
۷۔ زہیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کلام کو زیادہ سے زیادہ معیاری بنانے کی طرف خاص توجہ دیتا تھا۔ اور ہر طرح کی لفظی و معنوی خامیوں کو دور کرکے اثر آفرینی و دلکشی پیدا کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنا کوئی قصیدہ ایک سال سے پہلے منظر عام پر نہیں لاتا تھا کیونکہ اس کا معمول تھا کہ وہ قصیدہ کو چار مہینے میں نظم کرتا، پھر چار مہینے اس کی تہذیب و تنقیح میں لگاتا، اس کے بعد چار مہینے تک اسے خاص خاص لوگوں کے سامنے پیش کرتا، اس طرح پورے ایک سال میں وہ لوگوں میں مشہور ہوتا تھا۔ اسی لئے ان قصائد کو "حولیات" کہتے ہیں۔[1]

نمونۂ کلام | اس کی شاعری کا سب سے شاہکار نمونہ اس کا وہ معلقہ ہے

---

۱ جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج ۱ ص ۱۱۴، و احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی ص ۵۳، وابن قتیبہ: الشعر والشعراء ص ۵۰، و ابو زید قرشی: جمہرۃ اشعار العرب ص ۳۰۔

جو اس نے ہرم بن سنان اور حارث بن عوف کی صلح جویانہ کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا تھا۔

جاہلی شعری روایات کے مطابق اس کی ابتدا تشبیب سے ہوتی ہے۔ اس قصیدہ میں کم و بیش چونسٹھ اشعار ہیں، اور یہ بحر طویل سے ہے۔ مطلع یہ ہے:

أَمِنْ أُمِّ أَوْفَى دِمْنَةٌ لَمْ تَكَلَّمِ   بِحَوْمَانَةِ الدَّرَّاجِ فَالْمُتَثَلَّمِ

کیا متثلم اور دراج کی سخت زمین میں ام اوفیٰ کے گھر کے نشانات ہیں جو بولتے نہیں۔

مرکزی مضامین | اس قصیدے کے مرکزی مضامین حسب ذیل ہیں:

غزل یا تشبیب، صلح جوئی کی تعریف، تباہ کن جنگوں کا ذکر، حکمت و فلسفہ اور ضرب الامثال اخلاقی مضامین۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا مختصر جائزہ لیں گے۔

غزل یا تشبیب | زہیر کے غزلیہ اشعار میں فحاشی اور عریانیت نہیں ہے۔ ابتدا میں وہ ام اوفیٰ[1] کے ویران گھر کے نشانات کا ذکر کرتا ہے اور ان کو گودنے کے نقش سے تشبیہ دیتا ہے۔ آگے اس کی ویرانی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس گھر میں جنگلی جانوروں کے سوا کوئی نہیں رہا۔

بیس برس کے بعد وہ اس اجڑے دیار میں آیا ہے اس لئے گھر کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا ہے اور پہچاننے کے بعد بڑے والہانہ انداز میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

---

۱ یہ اس کی سابقہ بیوی کا نام ہے جس کو چھوڑنے کے بعد وہ بہت پچھتایا اور اس کی یاد کو دل سے نہیں نکال سکا۔ اس کی دوسری بیوی سے کعب اور بجیر پیدا ہوئے۔

وقفت بها من بعد عشرین حجة — فلأیا عرفت الدار بعد توهم

بیس برس کے بعد میں اس گھر تک پہنچا تو بہت غور کرنے کے بعد پہچانا۔

أثافي سفعا في معرس مرجل — ونؤیا کجذم الحوض لم یتثلم

پھر میں نے سیاہ سرخی مائل چولہوں کے پتھروں کو پہچانا جو ہانڈی رکھنے کی جگہ میں تھے اور اس نالی کو پہچانا جو حوض کے قریب بنائی گئی تھی اور ابھی ٹوٹی پھوٹی نہیں تھی۔

پھر جب گھر کو اچھی طرح پہچان لیتا ہے تو اس کے لئے سلامتی کی دعا کرتا ہے۔

فلما عرفت الدار قلت لربعها — ألا انعم صباحا أیها الربع واسلم

جب میں نے گھر کو پہچان لیا تو اس کے بیٹھک (ڈرائنگ روم) سے کہا کہ تو بخیر و سلامت رہ۔

محبوب کے مکان کو خیرباد کہہ کے جب وہ آگے بڑھتا ہے تو دوسرے محمل نشینوں کی طرف پھر جاتا ہے جنہوں نے اس کا دل موہ لیا تھا۔ اپنے ساتھی سے کہتا ہے۔

تبصر خلیلی هل تری من ظعائن — تحملن بالعلیاء من فوق جرثم

اے میرے دوست غور سے دیکھ کیا تو ان محمل نشینوں کو دیکھ رہا ہے جنہوں نے مقام جرثم کے اوپر سے پہاڑی زمین میں کوچ کیا۔

آگے شاعر ان اونٹوں پر پڑے ہوئے بیش قیمت پردے کا ذکر کرتا ہے جن پر پردہ نشین عورتیں سوار تھیں اور دامن کوہ سے ان کے گزرنے کی کیفیت بتاتا ہے کہ وہ بڑے ناز و انداز سے اور ہنسی ٹھٹھا کرتے ہوئے جا رہی تھیں، خوشحالی کے اثرات ان پر نمایاں تھے یہاں تک کہ جب وہ صاف شفاف تالاب پر پہنچیں تو وہاں اپنا خیمہ لگا کر ٹھہر گئیں اس طرح جیسے شہری لوگ پکنک منانے کے لئے سرسبز و شاداب مقامات پر ٹھہرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

فلما وردن الماء زرقا جمامه — وضعن عصي الحاضر المتخیم

پس جب وہ ایسے تالاب پر پہنچیں کہ جس کا پانی نیلگوں تھا تو انہوں نے شہری خیمہ زن کی طرح اپنی لاٹھیاں رکھ دیں یعنی قیام پذیر ہو گئیں۔

صلح جوئی کی تعریف

حسن و عشق کی باتوں کے بعد ہرم بن سنان

اور حارث بن عوف کی صلح جویانہ کاوشوں کی تعریف بڑے دلنشین انداز میں کرتا ہے، ابتدا قسمیہ جملے سے ہوتی ہے ملاحظہ ہو:

فأقسمت بالبیت الذی طاف حوله — رجال بنوه من قریش وجرهم

یمینا لنعم السیدان وجدتما — علی کل حال من سحیل ومبرم

پھر میں اس گھر کی قسم کھاتا ہوں جس کے گرد قریش اور جرہم کے ان لوگوں نے طواف کیا جنہوں نے اس کو بنایا ہے۔

عبادت کی قسم کہ تم دونوں (حارث بن عوف اور ہرم بن سنان) نرمی اور سختی ہر حال میں بہترین سردار ثابت ہوئے۔

سعی ساعیا غیظ بن مرة بعد ما — تبزل ما بین العشیرة بالدم

"آپس کی خونریزی کی وجہ سے دو قبیلے عبس اور ذبیان میں پھوٹ پڑ گئی تو غیظ بن مرہ کے دو آدمیوں نے صلح کرانے کی کوشش کی (مراد حارث بن عوف اور ہرم بن سنان ہیں)"

قبائلی جنگوں کا ذکر

زہیر اپنے دونوں ممدوحین کی صلح جوئی کی تعریف کرتے ہوئے ان قبائلی جنگوں کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کرتا ہے جن کو ختم کرانے میں ممدوحین نے اہم رول ادا کیا تھا۔ چنانچہ قبیلہ عبس اور ذبیان کی لڑائی کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایسا لگتا تھا کہ دونوں قبیلوں نے مشہور عورت منشم کا منحوس عطر اپنے اوپر مل کر لڑائی شروع کی تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ مگر اس کے دونوں ممدوحین نے بیچ میں پڑ کر صلح مصالحت کرا دی۔ ملاحظہ ہو:

تدارکتما عبسا وذبیان بعد ما — تفانوا ودقوا بینهم عطر منشم

قبیلہ عبس اور ذبیان کے لوگ منشم کا عطر مل کر لڑ لڑ کر نابود ہونے لگے تو تم دونوں نے ان کا تدارک کیا اور لڑائی ختم کرا دی۔

آگے لڑائی کی خطرناکی کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

مَتَى تَبْعَثُوهَا تَبْعَثُوهَا ذَمِيمَةً ‏ ‏ وَتَضْرَ إِذَا ضَرَّيْتُمُوهَا فَتَضْرَمِ

جب تم لڑائی کو دوبارہ برپا کرو گے تو بڑی بُری حالت ہوگی اور جب اس کو برانگیختہ کرو گے

تو آگ کی طرح بھڑک اُٹھے گی ۔

فَتَعْرُكُكُمْ عَرْكَ الرَّحَى بِثِفَالِهَا ‏ ‏ وَتَلْقَحْ كِشَافًا ثُمَّ تُنْتَجْ فَتُتْئِمِ

پھر وہ لڑائی تم کو اس طرح پیس ڈالے گی جس طرح چکی اپنے بچھے پاٹ کے ساتھ دانا پیستی ہے اور وہ سال میں دو مرتبہ حاملہ ہوگی تو جڑواں بچے جنے گی ۔

مطلب یہ ہے کہ وہ لڑائی اتنی پھیل جائے گی کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوگی ۔ ایک ہی شعر میں لڑائی کے لئے دو دو تشبیہات کا استعمال کتنی فنکاری سے کیا گیا ہے یہ زہیر ہی کا خاصہ ہے ۔

حکمت و فلسفہ اور ضرب الامثال

زہیر کے بہت سے اشعار نہایت ہی حکیمانہ اور فلسفیانہ خیال کی ترجمانی کرتے ہیں جو اتنے دقیع ہیں کہ ان کی حیثیت ضرب الامثال کی ہوگئی ہے ، ملاحظہ ہو ! موت کا وصف کتنے بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے ۔

رَأَيْتُ الْمَنَايَا خَبْطَ عَشْوَاءَ مَنْ تُصِبْ ‏ ‏ تُمِتْهُ وَمَنْ تُخْطِئْ يُعَمَّرْ فَيَهْرَمِ

موت کو میں نے اندھی اونٹنی کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے والی دیکھا جس کو وہ پالیتی ہے اسے آنے مار ڈالتی ہے اور جس کو نہیں مار تی وہ بہت جیتا ہے اور بوڑھا ہو جاتا ہے ۔

آگے کہتا ہے کہ موت سے کسی کو رستگاری نہیں چاہے وہ کہیں چلا جائے ۔

گذشتہ حاشیہ : لہ ایک عورت کا نام ہے جو کہ مکہ معظمہ میں عطر بیچا کرتی تھی ، بنی خزاعہ اور بنی جرہم جب آپس میں لڑنا شروع کرتے تھے تو اس سے ان کے بہت سے آدمی لڑائی میں کام آ جاتے تھے چنانچہ اس کا عطر منحوس سمجھا گیا اور یہ کہاوت مشہور ہوگئی «اشأم من عطر منشم» منشم کے عطر سے زیادہ ۔

وَمَنْ هَابَ أَسْبَابَ الْمَنَايَا يَنَلْنَهُ ‏ ‏ وَإِنْ يَرْقَ أَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمِ

جو شخص موت کے اسباب سے ڈرتا ہے ان کو وہ پالیتی ہے خواہ وہ سیڑھی لگا کر آسمان کے کناروں پر کیوں نہ چڑھ جائے ۔

یہ شعر قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تم کو ضرور پالے گی ۔

ایک جگہ بہت ہی حکیمانہ انداز میں وعظ و نصیحت کے طور پر کہتا ہے :

وَمَنْ لَمْ يُصَانِعْ فِي أُمُورٍ كَثِيرَةٍ ‏ ‏ يُضَرَّسْ بِأَنْيَابٍ وَيُوطَأْ بِمَنْسِمِ

جو شخص اکثر معاملات میں نرمی و مدارات نہیں کرے گا وہ دانتوں سے کاٹا جائے گا اور اونٹ کے پاؤں سے روندا جائے گا مطلب یہ ہے کہ جو دوسروں کے ساتھ نرمی اور بھلائی نہیں کرے گا وہ ذلیل و خوار ہوگا ۔

اخلاقی مضامین

زہیر کے یہاں اخلاقی قدروں کا بہت احترام پایا جاتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جاہلی دور میں ہوتے ہوئے بھی اللہ پر یقین رکھتا ہے اور اس کو عالم الغیب مانتا ہے ، یوم جزا و حساب ، کتاب کا بھی وہ قائل ہے جس کا ثبوت جابجا اس کے اشعار میں ملتا ہے ، ملاحظہ ہو :

فَلَا تَكْتُمُنَّ اللهَ مَا فِي نُفُوسِكُمْ ‏ ‏ لِيَخْفَى وَمَهْمَا يُكْتَمِ اللهُ يَعْلَمِ

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو ہرگز نہ چھپاؤ (یہ سوچ کر) کہ چھپ جائے گا ، جو کچھ تم خدا سے چھپاتے چاہو گے وہ اس کو جان لے گا ۔

يُؤَخَّرْ فَيُوضَعْ فِي كِتَابٍ فَيُدَّخَرْ ‏ ‏ لِيَوْمِ الْحِسَابِ أَوْ يُعَجَّلْ فَيُنْقَمِ

(عہد شکنی کی پاداش میں) جلدی کی جائے گی تو (دنیا میں) سزا دی جائے گی ، اور اگر دیر کی جائے گی تو یوم جزا کے لئے نامۂ اعمال میں رکھ چھوڑی جائے گی ۔

علاوہ ازیں اس کے قصیدہ میں وہ اشعار ایسے ہیں جو لفظ " مَنْ " (جو شخص) سے ،

شروع ہوتے ہیں اور سب اخلاقی مضامین پر مشتمل ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ نیکی بھلائی نیز حسن و فراخدلی، وعدہ وفائی اور خودداری کی تلقین بڑے ناصحانہ دلنشین انداز میں کی گئی ہے۔

مثال کے طور پر ان میں سے کچھ ملاحظہ فرمائیے۔

وَمَنْ يَجْعَلِ الْمَعْرُوفَ مِنْ دُونِ عِرْضِهِ   يَفِرْهُ وَمَنْ لَا يَتَّقِ الشَّتْمَ يُشْتَمِ

جو شخص اپنی عزت و آبرو کے واسطے نیکی و بھلائی کرتا ہے تو وہ اس کو بڑھاتا ہے اور جو گالی دینے سے نہیں بچتا تو اس کو گالی دی جاتی ہے۔

وَمَنْ يَكُ ذَا فَضْلٍ فَيَبْخَلْ بِفَضْلِهِ   عَلَى قَوْمِهِ يُسْتَغْنَ عَنْهُ وَيُذْمَمِ

جو شخص مالدار ہو اور اپنے مال میں اپنی قوم پر بخل کرے تو اس سے بے نیازی برتی جائے گی اور اس کی مذمت کی جائے گی۔

وَمَنْ يَغْتَرِبْ يَحْسَبْ عَدُوًّا صَدِيقَهُ   وَمَنْ لَا يُكَرِّمْ نَفْسَهُ لَا يُكَرَّمِ

جو شخص وطن سے باہر ہوتا ہے وہ دشمن کو دوست سمجھتا ہے اور جو اپنی عزت نہیں کرتا لوگ بھی اس کی عزت نہیں کرتے۔

وَمَنْ لَمْ يَزَلْ يَسْتَرْحِلُ النَّاسَ نَفْسَهُ   وَلَمْ يُعْفِهَا يَوْمًا مِنَ الذُّلِّ يَنْدَمِ

جو شخص ہمیشہ اپنے اوپر لوگوں کو سوار کرتا رہے اور اپنے آپ کو کسی ذلت سے نہ بچائے تو شرمندہ ہو کر رہے گا۔

اس کے بعد ہم جاہلی دور کے تیسرے مشہور شاعر نابغہ ذبیانی کا ذکر کریں گے۔

—— (جاری) ——

شریف احمد مبارکپوری

خدمت خلق

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کون سی درسگاہ ہے جہاں خدمت خلق کا سب سے اعلیٰ و ارفع سبق دیا گیا اور سبق کے ساتھ ساتھ عملی نمونہ بھی پیش کر دیا گیا تو جواب صرف اور صرف ایک ہوگا، وہ یکتا و بے نظیر و بے مثال درسگاہ، درسگاہ نبوت تھی۔ یہ حقیقت ہمارے سامنے اس وقت اور منقح ہو کر آتی ہے جب ہم سیرت نبوی کا مطالعہ کریں اور روز مرہ کے امور زندگی سے اس کا موازنہ کریں۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے روزانہ کے کاموں کے تین حصے کر رکھے تھے۔ ایک عبادات الٰہی کے لئے، دوسرا کام مخلوق کے لئے اور تیسرا اپنی ذات کے لئے۔ امام الہند ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ حالت قحط میں ایک صاحب نے باغ سے کھجور کے خوشے توڑ کر کھائے اور کچھ دامن میں رکھ لئے۔ باغ کے مالک نے اسے مارا اور کپڑے اتروا لئے۔ پھر شکایت لے کر حضورؐ کی بارگاہ میں آیا۔ بیچارا کھجور توڑنے والا بھی ساتھ تھا۔ آپ نے مالک باغ سے کہا یہ جاہل تھا، اسے تعلیم دینی چاہئے تھی، بھوکا تھا، کھانا کھلانا چاہئے تھا۔ یہ فرما کر کپڑے واپس دلائے اور اسے ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے دیا، جو ہمارے حساب سے تین من تیرہ سیر اور دو چھٹانک ہوتا ہے۔"

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک خدمت خلق کی کتنی اہمیت تھی، اس کا پتہ اس

واقعہ سے چلتا ہے کہ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں ایک قافلہ آیا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی کسی کے بدن پر نہ کپڑے تھے نہ پاؤں میں جوتے ، بلکہ بدن پر ٹاٹیں بندھی ہوئی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ جب ان لوگوں پر پڑی تو آپ کے چہرۂ انور کا رنگ متغیر ہوگیا ، آپ نے بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ نماز کے بعد ایک خطبے میں سب کو ان غریبوں کی امداد پر آمادہ کردیا۔ اس بات کی اہمیت صحابۂ کرام کے دلوں میں اچھی طرح اتر چکی تھی کہ وہ دوسروں کی بھلائی میں اپنی بھلائی سمجھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ مسجد نبوی میں معتکف تھے کہ ایک شخص اس مسجد میں داخل ہوا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا حضرت میں بہت پریشان ہوں، ایک صاحب کا میرے اوپر کچھ قرض ہے اور جو مدت کے لئے لیا تھا وہ مدت پوری ہوگئی میرے پاس کوئی انتظام نہیں ہے کہ میں اس کی ادائیگی کرسکوں اب سوائے ذلت اور رسوائی کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس شخص کی جب بات سنی تو بولے کیا میں اس قرض خواہ سے تمہارے لئے سفارش نہ کردوں اور یہ کہتے ہوئے اس اجنبی آدمی کو ساتھ لے کر مسجد سے باہر آگئے۔ وہ اجنبی آدمی کہنے لگا حضرت آپ اعتکاف میں بیٹھے ہیں اور اعتکاف میں بیٹھنے والا آدمی سوائے خاص خاص موقعوں کے باہر نہیں نکل سکتا۔ کہیں اس بات کو آپ بھول تو نہیں گئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا نہیں میں نے اللہ کے حبیبؐ کو فرماتے ہوئے یہ بات سنی ہے کہ :

"جو شخص اپنے بھائی کے کسی کام کے لئے چلا اور اس کی سہولت کے لئے کچھ کیا تو یہ بات ایک سال کے اعتکاف سے بہتر ہے۔"

صحابۂ کرام کے اس طرح کے کارناموں سے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں جن کا اس مختصر سے مقالہ میں احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ صحابۂ کرام کے بعد تابعین و تبع تابعین اسی عملی نمونہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے اور اسی جذبہ کے تحت اپنے بال بچوں کو قربان کرکے دور دراز کا سفر کیا اور جہاں گئے وہیں اپنی قبریں بنوائیں۔ انھیں ہر آن یہ فکر

لاحق رہتی تھی کہ بنی نوع انسان کا رشتہ کس طرح خالق کائنات سے جڑ جائے اور یہ سب سے بڑی خدمت خلق ہے۔ ضلالت و گمراہی کے قعر مذلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو نکال کر صراط مستقیم پر لگا دیا جائے۔ یہ لوگ جہاں جہاں گئے وہاں کے رہنے والوں نے ان کا طرز عمل دیکھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور اپنے لئے سعادت کا باعث سمجھا۔

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اپنی کتاب "خلافت امویہ اور ہندوستان" میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں سے عقیدت و محبت کی وجہ ان کی مالی نہ اقتدار اور سیاسی برتری نہیں تھی بلکہ ایمانی و دینی زندگی کی وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے ان میں بے پناہ کشش پیدا کردی تھی، جس بستی میں ان کا گزر ہوتا لوگ ان کی دید و زیارت کیلئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ خدا پرستی، دین داری، خلوص و ایثار، اخلاق و کردار، امانت و دیانت، نصیحت (خیر خواہی) خدمت و محبت، سادگی و بے تکلفی اور سیدھی سچی زندگی جیسے صفات عالیہ نے مسلمانوں میں شان محبوبی پیدا کردی تھی۔" ص ۳۳

مولانا کے اس اقتباس سے یہ بات مترشح ہوجاتی ہے کہ ہندوستان میں نووارد مسلمانوں کے اندر وہی جذبۂ ایثار و محبت کارفرما تھا جس کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پورے ملک کا حکمراں بنادیا، اور صدیوں تک ان کی حکومت قائم رہی۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے اسلاف اور اکابرین کے نقوش اپنے پیش نظر رکھیں اور اخلاص کے ساتھ اپنے اندر خدمت خلق کا جذبہ پیدا کریں۔ ہمارے لئے مذکورہ باتیں خواب و خیال کی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اتنا تو ہوسکتا ہے کہ غریبوں اور یتیموں کا سہارا بنیں، راہ میں پڑی ہوئی وہ اشیاء جس سے عوام الناس کو تکلیف پہنچ رہی ہو دور کردیں، اپنی ضرورت کو مؤخر کرکے دوسرے بھائی کی ضرورت کو مقدم رکھیں، جو چیز اپنے لئے پسند کریں وہی چیز دوسروں کے لئے بھی پسند کریں، جو بات دل میں ہو وہی بات زبان پر لائیں۔ یعنی قانون قدرت کو مکمل طور پر اختیار کرلیں پھر تو معاشرے میں بہار آجائے گی۔ اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ——

آدمی ہو تو آدمی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ

محرک ہی تھا۔ اور اس کے خاتمہ کے لیے آپ نے جو جدوجہد کی اس کا اندازہ تو آپ کی سیرت کے مطالعہ ہی سے لگایا جا سکتا ہے البتہ آپ کا ایک ارشاد اسے سمجھنے کے لیے کافی ہے یعنی ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

لیس منا من دعا الی عصبیة	وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت
ولیس منا من قاتل عصبیة	کی طرف بلائے اور نہ ہی وہ شخص ہم میں
ولیس منا من مات علی عصبیة	سے ہے جو عصبیت کی بنیاد پر جنگ کرے
رواہ ابوداؤد عن جبیر	اور نہ وہ شخص ہم میں سے ہے جو عصبیت
بن مطعم رضی اللہ عنہ	پر مرے۔

(ابوداؤد)

لیکن افسوس آپ کی کوششوں کے اثرات خلافت راشدہ کے بعد دھیرے دھیرے زائل ہوتے چلے گئے اور خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد تو بالکل ہی ختم ہو گئے اور عصبیت جاہلیہ آہستہ آہستہ اپنی چادر پھیلاتے ہوئے پوری دنیا پر بالکل چھا گئی اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ اہل کتاب کی طرح خود مسلمان بھی اسی کے شکار ہو گئے۔ اور فرقہ، ذات، برادری اور رنگ و وطن کے نام پر سب کچھ کرنے لگے اور یہ سب کچھ ان کے یہاں معیوب بھی نہیں رہا۔ لہٰذا ماضی کی طرح اس حالت کے جو ثمرات برآمد ہوتے تھے وہ آج بھی برآمد ہو رہے ہیں۔ پوری نوع انسانی اس کے کڑوے کسیلے پھل سے کراہ رہی ہے اور اہل باطل اس کی آڑ میں اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل ایمان میں وہ لوگ جو اس کی نزاکت کا شعور رکھتے ہیں اٹھیں اور اس عصبیت جاہلیہ کے خاتمے کی کوشش میں لگ جائیں۔ الحمد للہ تحریک اسلامی اس میدان میں کوشاں ہے اور مرتب کی یہ کوشش بھی اسی کی ایک کڑی ہے جیسا کہ مرتب نے خود عرض مرتب میں لکھا ہے:

"میں نے یہ کتابچہ نفسانیت سے ہٹ کر خالصاً للہ عوام کی اصلاح اور

★ عبدالباری فلاحی

تعارف وتبصرہ

نام کتاب	ملت میں گم ہو جا
مرتب	اقبال احمد خان
ناشر	مکتبہ عنایت موضع کلونا، ڈاکخانہ دھیریا، ضلع گیا، بہار
صفحات	۸۴
قیمت	۶ روپئے ۵۰ پیسے
کتابت وطباعت	اوسط

یہ کتاب دراصل شاعر مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے ان اشعار کی تشریح ہے

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اسے مرتب نے قرآن مجید، احادیث اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہم کی کتابوں کے اقتباسات سے ترتیب دیا ہے اور پھر ان کی روشنی میں اپنے مقصود و مدعا کی وضاحت کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی معرکۂ حق و باطل کی ایک اہم بنیاد عصبیت جاہلیہ رہی ہے حق نے ہمیشہ اسے دبانے کی کوشش کی ہے اور باطل نے اسے اپنے سب سے زیادہ کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور ہمیشہ یہ ہتھیار انسانیت کے لیے ناسور سے کم ثابت نہیں ہوا ہے۔

خود نبی کریمؐ کی بعثت کے وقت بھی جو نسلی امتیازات اور خانہ جنگی تھی، اس کا اصل

عصبیت کے خاتمے کے لئے ترتیب دیا ہے۔" ص ۱۹

اللہ موصوف کے اس گراں قدر جذبے اور کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین۔

البتہ چند چیزیں ایسی ہیں جن کا اگر آئندہ اشاعت میں خیال رکھا جائے تو اس کی افادیت کافی بڑھ سکتی ہے ورنہ اس سے کماحقہ افادہ ممکن نہ ہوگا۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ کتابت کی غلطیاں درست کر دی جائیں کہیں تو الفاظ چھوٹ گئے ہیں مثلاً ص ۹۱ پر "یا مروت" کے بعد "بالمعروف" چھوٹ گیا ہے۔ کہیں الفاظ کی غلط کتابت ہی ہو گئی ہے مثلاً ص ۳۵ پر صحابی کا نام جبیر بن معظمؓ لکھا گیا ہے حالانکہ وہ اصلاً "جبیر بن مطعم" ہے۔ اور کہیں الفاظ زائد لکھ دیئے گئے ہیں مثلاً ص ۹۳ پر سورۂ آل عمران کی ایک آیت اور اس کا ترجمہ نقل کرنے کے بعد پھر اسی آیت کے ایک جزء "اولئک لھم عذاب عظیم" کی کتابت بے معنی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دوسری چیز یہ ہے کہ جو آیات، احادیث اور اقتباسات نقل کئے گئے ہیں ان کے حوالے مکمل نہیں ہیں مثلاً آیات کس سورۂ کی ہیں اور آیت نمبر کیا ہے؟ یا احادیث کس کتاب کے کس باب کی ہیں یا اقتباسات کس کتاب کے کن صفحات سے ماخوذ ہیں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جو کچھ اس میں جمع کیا گیا ہے ان تمام کی ترتیب میں ایک معنوی ربط ہونا چاہیے جو محسوس نہیں ہوتا۔ موتیوں سے پروئے ہوئے ہار کی جو اہمیت ہوتی ہے وہ بکھرے ہوئے موتیوں کی کبھی نہیں ہوتی۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ آیات قرآنی اور احادیث وغیرہ کا ترجمہ کرتے یا نقل کرتے وقت ان کے الفاظ کی رعایت از حد ضروری ہے، بطور خاص اس وقت جب کہ عبارتوں سے ممیز کر کے اسے نقل کیا جا رہا ہو، مثلاً ص ۱۸ پر سورۂ آل عمران کے ۱۰۶ آیت کو اردو میں عام عبارت سے ممیز کر کے نقل کیا گیا ہے لیکن اس کے اندر جو ترجمہ ہے آیت کے اندر اس کے متحمل الفاظ نہیں ہیں یعنی یہ جملہ " جن لوگوں نے پھوٹ ڈال کر اور پھوٹ ڈالے کارنامے انجام دے کر مسلمانوں کو توڑا ہوگا"...... اس معنی کو ادا کرنے والے آیت کے اندر

کون سے الفاظ ہیں؟ خدارا اس سے اجتناب کیجئے۔ یہی وہ چیز ہے جو کتاب الٰہی میں تحریف کے دروازے کھولتی ہے۔ اللہ ہم سب کو بچائے۔ پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ ص ۴۰ پر آپ نے ایک عنوان قائم کیا ہے "عصبیت کا نعرہ لگانے والے کو باپ کی گالی دو" اور پھر مضمون میں ایک حدیث کا ذکر کیا ہے کہ "حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جو تمہارے سامنے جاہلیت کا نعرہ لگائے تو اس کو باپ کی گالی دو"

لیکن تعجب ہے کہ اتنی سنگین بات آپ نے کہہ ڈالی لیکن اس کے ثبوت میں جو حدیث آپ نے پیش کی ہے اس کا حوالہ نہیں دیا ہے اور نہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا ہے۔

واضح رہے کہ یہ روایت درایت دونوں پہلوؤں سے محل نظر ہے گرچہ جس حدیث کا آپ نے ترجمہ پیش کیا ہے اس کا ذکر مشکوٰۃ المصابیح، باب المفاخرۃ و العصبیۃ میں شرح السنۃ کے حوالے سے اور مسند احمد میں الفاظ کے کچھ ردوبدل کے ساتھ ہے لیکن اولاً یہ حدیث غریب ہے چنانچہ محدثین نے اس کا ذکر غریب الحدیث میں کیا ہے، دوسرے یہ کہ عربی کے جو الفاظ آئے ہیں اس میں اس بات کی گنجائش ہے کہ اس سے کہنے والے کو لعن طعن کرنا مراد لیا جائے بلکہ یہی بہتر ہے کیونکہ اگر گالی دینا مراد لیتے ہیں تو اس سے اسلام کا یہ اصول ٹکراتا ہے کہ کسی غلط چیز کو دور کرنے کے لئے کبھی غلط ذرائع نہیں استعمال کئے جائیں گے بلکہ ہمیشہ اچھے ذرائع کا استعمال کیا جائے گا اور گالی دینا کبھی بھی اچھے ذرائع میں شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کا حکم یا اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔

امید کہ میری ان معروضات پر آپ ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے اور اگر قابل لحاظ معلوم ہوں تو توجہ فرمائیں گے۔

آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو عصبیت جاہلیہ سے بچائے اور آپ کی کوششوں سے لوگ بھی بچنے کی توفیق پائیں۔ آمین

شہنواز قمر بنارسی

مستقل عربی مترجم

اخبارِ علمیہ

چین میں اسلامی تعلیم

چین کی موجودہ اسلامی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ چین میں اسلامی تعلیم کی تاریخی بنیاد بہت پہلے سے پڑی ہے۔ اور یہ کہ جب چین میں اسلام پہنچا اس وقت سے وہاں کے مبلغین حضرات نے اسلامی تعلیم کے کام میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ چیز جو اس سلسلہ میں ریسرچ اور تحقیقات کی ندرت کا باعث بنی وہ یہ کہ وہاں پر اسلامی تعلیم کی تاریخ کو مدون کرنے پر اہتمام نہیں برتا گیا۔

ابھی حال ہی میں وہاں بعض ایسی تحقیقات سامنے آئیں جو چین میں اسلام کی تاریخ سے بحث کرتی ہیں۔ ان تحقیقات نے بعض اہم دستاویزوں اور چین میں اسلامی تعلیم کے علمبرداروں کے نام اور اسلام کے صحیح علوم کو نشر کرنے میں ان کے ادوار کا اور اسلامی فکر کو تمام شک وشبہات سے پاک کرنے میں ان کی کوششوں کا انکشاف کیا۔ ان تحقیقات کے کرنے والوں میں الشیخ محمود یوسف جوایی اور الشیخ محمد تواضع ہیں۔

(اخبار العالم الاسلامی)

استنبول میں ایک اسلامی جلسہ

استنبول میں اسلامی تاریخ فن اور کلچر کا ایک ریسرچ سنٹر R.C.I.H.AC ہے جو آئندہ دس اکتوبر کو اپنے قیام کا دسواں سالانہ جلسہ کا انعقاد کرے گا۔

جلسہ کا افتتاح ترکی کے صدر ترگت اوزل (Turgut. Ozal) کے ذریعہ ہوگا اور جلسہ کے ناظم اسلامی جلسہ تنظیم (O.I.C) کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر حمید الغابد ہوں گے۔ توقع ہے کہ جلسہ میں استنبول ڈاکٹر اکمال الدین جو کہ مرکز (I.R.C.I.C.A) کے ڈائرکٹر ہیں، اسلامی ممالک کے نمایاں ترین سکالرس کا خطاب ہوگا۔ جلسہ کا پروگرام ایک دستاویزی فلم شو پر مشتمل ہے جو مرکز کی ان کامیابیوں اور ترقیات کو نمایاں کرے گی جس کو مرکز نے دس سال پہلے اپنے قیام سے لے کر اب تک کیا ہے۔ یہ دستاویزی فلم ترقی اور مدت کے ان مراحل کو بھی دکھائے گی جن میں تاریخی مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ اور ساتھ ہی یہ فلم مرکز کی لائبریری کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف ریسرچ شعبوں کی توسیع پر بھی روشنی ڈالے گی۔ اس جلسہ میں مرکز کی جانب سے شائع کردہ کتابوں کی نمائش بھی لگے گی۔

اور اس جلسہ میں ان اسلامی ترکوں کی تعداد پر بھی نمائش کی جائے گی جن کا تعلق سو سال پہلے سے ہے۔

بڑھتی آبادی اور کھانے کے مسئلہ پر مسلم ورلڈ لیگ کی جانب سے شائع کردہ ایک کتاب

مسلم ورلڈ لیگ نے "ضبط ولادت اور کھانے کے مسئلہ سے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر" عنوان کے تحت ایک کتاب شائع کی ہے۔

ڈاکٹر علی عبدالمنعم صابری کی تصنیف کردہ اس کتاب میں ضبط ولادت اور معاشی مسائل پر اور پھر اسلامی قانون کی روشنی میں اس کے حل پر بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس کتاب میں ایک ایسے خاص ومنفرد طرز تعلیم پر خصوصی زور دیا گیا ہے جو مجموعی طور پر سماج کی بہبود وفلاح کی رہنمائی کرے۔

ڈاکٹر صابری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اسلام دولت کو سماج کے ہر طبقہ میں بانٹنے کی ضمانت لیتا ہے۔

(مسلم ورلڈ نیوز)

(بقیہ صفحہ ۷۲ پر)

جامعہ کے لیل ونہار

محمد اسمٰعیل فلاحی

امیر جماعت اسلامی کی آمد

امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد سراج الحسن صاحب ۱۰ر اگست ۹۰ء کو جامعہ تشریف لائے، موصوف کے ہمراہ نائب امیر برائے دعوت جناب شفیع مونس صاحب، نائب امیر برائے تربیت مولانا جلال الدین انصر عمری صاحب، سکریٹری جماعت جناب سید یوسف صاحب، امیر حلقہ یوپی مولانا رفیق احمد قاسمی صاحب اور ناظم علاقہ الہ آباد مولانا نظیر عالم صاحب فلاحی بھی تشریف لائے۔

جامعہ کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں محترم امیر جماعت نے ایک مختصر خطاب فرمایا جس میں جامعہ کے مقاصد اور ملک کے حالات پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ تحریک دعوت کو آپ سے بڑی توقعات ہیں۔ مولانا جلال الدین انصر عمری صاحب نے اپنے خطاب میں طلبہ کو بے پناہ محنت اور عمل پر زور دیا اور فرمایا آپ تحریک و دعوت کے لئے اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں جبکہ آپ کا مطالعہ وسیع اور علم گہرا ہو۔

مولانا محمد امانت اللہ صاحب اصلاحی کی آمد

مولانا محمد امانت اللہ صاحب اصلاحی (مقیم نائجیریا) اپنے گھر تشریف لائے تھے ۱۸ر اگست ۹۰ء کو مولانا اصلاحی کے ساتھ جامعہ کے اساتذہ و طلبہ کی ایک نشست رہی۔

نے فرمایا تعلیم کا مزاج یکسوئی چاہتا ہے اور استاد و شاگرد کے درمیان ہم آہنگی اور خوشگوار ماحول کا طالب ہے۔ مجھے توقع ہے کہ عزیز طلبہ اس معیار پر پورے اتریں گے۔

ہمارے طلبہ کی نمایاں کامیابی :

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی جانب سے اس سال تدریبی کیمپ جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں [illegible] شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی ہمارے طلبہ نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ایک طالب علم نے فرسٹ ڈویژن اور بقیہ سب نے ممتاز نمبرات حاصل کئے۔

شوریٰ کا اجلاس :

انجمن طلبہ قدیم کی شوریٰ کا اجلاس ۲۲ و ۲۳ر اکتوبر ۹۰ء کو جامعہ میں ہونا طے پایا ہے نیز ۲۳ و ۲۴ر اکتوبر کو تعلیمی کمیٹی کی میٹنگ ہوگی اور ۲۵ و ۲۶ر اکتوبر ۹۰ء کو انتظامیہ کا اجلاس ہوگا۔

اسٹاف میں اضافہ :

مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی جامعۃ الفلاح کے بڑے اساتذہ میں تھے جماعت اسلامی ہند کی درخواست پر گجرات امیر حلقہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے وہاں سے دستبرداری پر دوبارہ مولانا کی خدمات جامعہ کو حاصل ہو گئی ہیں۔

ادھر مزید تقرریاں عمل میں آئی ہیں۔ اس دوران اسٹاف میں نئے شامل ہونے والے حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ ماسٹر ظفر عالم صاحب ایم اے، پی جی ڈی پی (جرنلزم)
۲۔ ماسٹر منور علی خاں صاحب (ایم اے، بی ایڈ) (ایکس سارجنٹ ایئر فورس)
۳۔ ماسٹر فاخر حق صاحب (انٹرمیڈیٹ، آئی ٹی آئی)

امتحان اور تعطیل:

اس وقت ششماہی امتحان جاری ہے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو آخری پرچہ ہوگا۔ اسی روز طلبہ گھروں کو جاسکیں گے۔ ۱۲ راکتوبر ۱۹۸۰ء اتوار کو جامعہ دوبارہ کھل جائے گا۔

وفیات:

اطلاع ملی ہے کہ اس سال فارغ ہونے والے خلاقی برادر وفیا محمد (مالیگاؤں) کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اللہ مرحوم کی مغفرت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔

بقیہ:- اخبار علمیہ

رابطہ عالم اسلامی کی سرگرمی:

رابطہ عالم اسلامی کے دفتر کی جانب سے دنیا کے مختلف ممالک میں اسلامی مدارس تنظیموں اور مراکز کو کتابوں کا ہدیہ ارسال کیا گیا۔ جیسے کہ مغربی افریقہ کے اسلامی جمہوریہ موریتانیہ میں ایک مدرسہ "مدرسۃ العون للتعلیم الاسلامی" کو، اور مغربی افریقہ کو جمہوریہ ساحل العاج ( ) میں مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم کو اور ماریشس میں ایک اسلامی مرکز کو اور اسی طرح دوسرے بہت سے ممالک میں جہاں کتابیں ارسال کی گئیں۔

مرسلہ کتابوں میں بہت سے مصاحف شریفہ اور قرآن مجید کے مختلف پارے مثلاً عم اور پارہ تبارک کی فرانسیسی زبان میں تفاسیر تھیں۔ اور اسی طرح فرانسیسی زبان میں دوسری بہت سی فقہی اور اسلامی ثقافتی کتابیں تھیں۔

ان کتابوں کے ارسال کا مقصد اسلامی علوم کو عام کرنا تھا اور یہ کہ مسلمان جس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔

(اخبار العالم الاسلامی)